فصلِ سلاسل

احسان دانش

دانش آباد، ۳۷ نیو انار کلی لاہور

فصلِ سلاسل

احسان دانش

فصلِ سلاسل

احسان دانش

دانش آباد، ۳۷ نیو انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

فصلِ سلاسل

احسان دانش

مطبع : نقوش پریس، لاہور

ناشر : صغیر احمد مرزا

طبع اول : ۱۹۸۰ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳۰ روپے

خطاط : خورشید رقم و ظہور ناظم

دانش آباد، ۳۷، انار کلی، لاہور

حلقے

نمبر شمار		صفحہ
۲-	فہرس	۳
۳-	ابتدائیہ	۱۰
۴-	محرابِ خیال	۱۲
۵-	بدرگاہِ سرورِ کائنات	۱۳
۶-	سرسیّد کی رُوح سے	۱۵
۷-	کارواں کا غم	۱۷
۸-	تبکدے سے حرم تک	۱۸
۹	آہ ابوالکلام	۲۰
۱۰	مجاہد	۲۱
۱۱	تم	۲۲
۱۲	ایک ناتمام پیغام	۲۳ تا ۲۶
۱۳	لمحہ فکریہ	۲۷
۱۴	دوگانہ کا تقاضا	۲۹
۱۵	ہم نہیں سمجھے	۳۳
۱۶	تحریکِ غدر ۱۸۵۷ء	۳۶
۱۷	حرفے چند	۳۷

۱۸	جو وقت نزدیک آ رہا ہے	۳۹
۱۹	آرام کا یہ ہنگام نہیں	۶۲
۲۰	میرا وطن سو رہا ہے	۶۷
۲۱	نئے اراکینِ حکومت کے نام	۷۱
۲۲	اشارات	۷۳
۲۳	فرد	۷۵
۲۴	اذانِ حیات	۷۷
۲۵	کیا چاہتے ہو	۷۹
۲۶	شہرِ غزل	۸۱
۲۷	اب کہو کارواں کدھر کو چلے	۸۳
۲۸	برا ہو اِس محبت کا کہاں تک بات جا پہنچی	۸۵
۲۹	آپ کے جلوے جہاں تقسیم ہو کر رہ گئے	۸۷
۳۰	ذرہ بہ ذرہ ہے نہاں رازِ حقیقت چمن	۸۹
۳۱	نکلوں جو یہاں سے تو بھلا جاؤں کہاں اور	۹۱
۳۲	پاسِ ادب ہے اس لیے ہم بولتے نہیں	۹۳
۳۳	دل اب یہ حسنِ شام و سحر مطمئن نہیں	۹۵
۳۴	دیدہ و دل کو ہراساں نہیں دیکھا جاتا	۹۷

۳۵	کب سے خزاں ہے کوئی خبر لے بہار کی	99
۳۶	ہزار بار جلا گرچہ آشیاں اپنا	101
۳۷	ہے کون کہیں جس کی ملاقات نہیں ہے	105
۳۸	کوئی بتاؤ ٹھکانا ہے اب کہاں اپنا	107
۳۹	مفت بازارِ محبّت میں تماشا نہ بنے	111
۴۰	آیا ہے حسن حشر کا ساماں کیے ہوئے	113
۴۱	گزرا بھی سرِ منزل بھلا کہاں اپنا	116
۴۲	بت ہو کہ خدا میری نظر دونوں طرف ہے	120
۴۳	نظر بنتی ہے نغمہ خوشِ دلِ ناشاد ہوتا ہے	123
۴۴	تہذیب کے دربان کئی سال سے چپ ہیں	125
۴۵	یہ بھی درست خود پہ ہماری نظر نہیں	127
۴۶	بطورِ خود کسی کا جب وہ مستقبل بدلتے ہیں	129
۴۷	جہاں کشتگانِ ستم سو رہے ہیں	132
۴۸	ضبطِ غم کو سوزِ غم کا ترجماں سمجھا تھا میں	133
۴۹	ہم خود کو زندگی سے خفا جانتے نہیں	135
۵۰	روز اوّل سے وفاؤں کا جفا انجام ہے	137
۵۱	کس کی یاد آئی کہ خود کو بیوفا کہنے لگے	139

۵۲	جس راہ پہ لوگ چل رہے ہیں	۱۴۱
۵۳	جو وقت گزر رہا ہے ہمدم	۱۴۳
۵۴	دیکھے توفیقِ نظر جلووں کو ارزاں کر دیا	۱۴۵
۵۵	اِدھر وفا ہے اُدھر بے رخی ہے نخوت ہے۔	۱۴۷
۵۶	کہاں کا حشر، کیا روزِ جزا کچھ لوگ کہتے ہیں	۱۴۹
۵۷	پیدا ترے اشکوں میں اثر کون کرے گا	۱۵۲
۵۸	دے کے توفیقِ نظر جلووں کو ارزاں کر دیا	۱۵۴
۵۹	وعدہ نہ سہی یونہی چلے آؤ کسی دن	۱۵۵
۶۰	یارانِ دھر پہ نہ خوشی کا مدار رکھ	۱۵۷
۶۱	اوّل سے آدمی ہے خدا کی تلاش میں	۱۶۰
۶۲	روداد	۱۶۲
۶۳	نئے خداوندانِ سیاست سے	۱۶۳
۶۴	آج کل	۱۶۷
۶۵	مداری	۱۶۹
۶۶	یومِ اقبال پر	۱۷۱
۶۷	اراکینِ دارالعلوم دیوبند سے	۱۷۵
۶۸	ساقی	۱۷۷
۶۹	آزادی کے بعد	۱۷۹

۷۰ دیکھئے کیا ہو ۱۸۷
۷۱ اذانِ سخن ۱۸۹
۷۲ لہو کے چراغ ۱۹۱
۷۳ آفاقی دستور ۱۹۱
۷۴ عصرِ حاضر ۱۹۵
۷۵ درس گاہ ۱۹۷
۷۶ کاوشِ نظر ۲۰۱
۷۷ نقشِ عمل ۲۰۳
۷۸ خراجِ عقیدت ۲۰۷
۷۹ زندگی کے مختلف نظریے ۲۱۲
۸۰ الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل ۲۱۳
۸۱ آثار ۲۲۰
۸۲ سہرا ہے ۲۲۳
۸۳ ایک ہوک ۲۲۶
۸۴ جوابی اقدام ۲۳۱
۸۶ دعوت نامہ ۲۳۴
۸۷ یہ لوگ ۲۳۷

۸۸	آزادی	۲۴۰
۸۹	خراشِ وقت	۲۴۳
۹۰	ثارِ انقلاب (نظم)	۲۴۶
۹۱	عالمِ گو مگو (نظم)	۲۴۹
۹۲	زندگی گذرتی ہے یوں کبھی کبھی تنہا	۲۵۲
۹۳	یہ کشاکش کب تھی ممکن رہبرِ کامل کے بعد	۲۵۴
۹۴	جو رشتہ گل و شبنم سمجھ نہیں سکتے	۲۵۶
۹۵	عشق کی طبیعت جب درد آشنا ہو گی	۲۵۸
۹۶	بت پرستی کا جو حق ہے وہ ادا بھی تو کرو	۲۶۰
۹۷	رازِ الفت چھپا کے پچھتائے	۲۶۲
۹۸	وہ خزاں بھی ہے خوشگوار اے دوست	۲۶۴
۹۹	بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا	۲۶۷
۱۰۰	خموشی سے مذاقِ عشق پنہاں ہو نہیں سکتا	۲۷۰
۱۰۱	نہ خود کو حد سے بڑھاؤ ہماری بات سنو	۲۷۳
۱۰۲	ہمارا ہو گیا وہ دشمنِ جاں کون کہتا ہے	۲۷۶
۱۰۳	سنا تو اور کچھ تھا یہ فضا کچھ اور کہتی ہے	۲۷۹
۱۰۴	فطرت کا جو وعدہ ہے وفا ہو کے رہے گا	۲۸۲
۱۰۵	ہر لحظہ نگاہوں میں ہے رنگِ دو جہاں اور	۲۸۵
۱۰۶	دامن سے بلا ہے نہ نگاہوں سے بلا ہے	۲۸۷

انتساب

بصد خلوص و ارادت اپنی یہ کتاب "فصلِ سلاسل"

جناب محترم جنرل ضیاء الحق صاحب صدرِ پاکستان

کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

احسان دانش عفی عنہٗ

دانش آباد - ۳۷ نیو انارکلی، لاہور

اِبتدائیہ

"فصلِ سَلاسِل" یہ میرا مجموعۂ کلام ہے جس میں پاکستان سے پہلے کے شب و روز کی تلخیاں اور بعد کی سُلگتی ہوئی خراشیں شامل ہیں۔ ہر چند کہ میں اپنی صداقت پسندی اور حقیقت نگاری کے جُرم میں زندگی بھر مشکلات سے دوچار اور پریشانیوں سے دُوبدو رہا ہوں۔ مگر کیا کروں خدا نے مجھے حقیقت پسند دل اور دروں بیں نظر بخشی ہے اور میں اسے انعام و عطا کا نام دیتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں نے کبھی اپنے غم و آلام کا شکوہ نہیں کیا۔ میری نظر ہمیشہ گرد و پیش کی معاشری پستیوں اور اخلاقی ناہمواریوں پر رہی ہے۔ میں نے ہر پیش آنے والی مشکل کو سینے سے لگا کر خُدا کا شکر ادا کیا ہے ؎

ہزار شکر کہ ذوقِ نظر دیا تو نے　　بڑا کرم ہے کہ برباد کر دیا تو نے

میرا ایمان ہے جو معاشرہ حکمِ خداوندی اور شریعتِ پیغمبریؐ کے خلاف ہوگا۔ وہ منزلِ مقصود سے محروم رہے گا۔ اس زندگی کے سفر میں میری نظر سے اخلاقی شکست و ریخت اور روایات و مسلّمات کی توڑ پھوڑ کے کئی سنسناتے ہوتے سیلاب گزر گئے لیکن میں مطمئن تھا کہ ایک دن وہ بھی ضرور آئیگا جب ایمان و ایقان کی مشعلوں سے در و دیوار جگمگا اٹھیں گے اور افسانوں کی جگہ حقیقتیں لے لیں گی کیونکہ

فطرت ہمیشہ اپنے خلاف محاذ کے عزائم و عمل کو برداشت نہیں کرتی۔

الحمدللہ میں نے اپنی زندگی میں وہ دن دیکھ لیا کہ پورے ملک میں اسلامی پرچم کے سائے میں اسلامی اصولِ حیات اور شعارِ محمدی کی گھما گھمی ہے۔ اب خدانخواستہ کوئی انقلاب آیا تو اس کا سبب مسلمانوں کی غفلت، تن آسانی اور اقتدار پرستی کے علاوہ مذہب بیزاری اور انسان دشمنی ہو گی۔

یہ میں اپنا وہ کلام چھپوا رہا ہوں جس کی شرح جہاں میری زندگی کے عکس سامنے لائے گی وہیں راہوں کے معاشرے کی تاریخ بھی مرتب کر سکے گی۔ اس میں کئی نظمیں تو ایسی ہیں جو مورخین اور محققین کو تفصیلی لوازمہ دیں گی۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دَور کے انتظار میں میرے بال سفید ہو گئے۔ لیکن میرے کلام کی صداقت اپنی رنگا رنگ روشنیوں سے دست بردار نہیں ہوئی۔ میں نے دورِ حاضر سے پہلے کی شاعری کے چار مجموعے مرتب کیے ہیں۔ جن میں سے پہلا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر یہ مقبول ہوا تو دوسرے مجموعے بھی شائع کروں گا اور مقبول نہ ہوا تو میرے غروب کے ساتھ یہ خمول کے جزدان میں ہی بھلے رہیں گے۔

والسلام

احسان دانش (ستارۂ امتیاز)

دانش آباد ۳۷ نئی انارکلی لاہور

محرابِ خیال

بارہا احساسِ خودداری نے لہرائے علَم
پھر شکستِ فاش جب کھاتی مرا سر جھک گیا
قادرِ مطلق تو بیشک تُو ہے لیکن اے خدا
کیوں مجھے مجبورِ مطلق کہتے کہتے رُک گیا؟

بدرگاہِ سرورِ کائناتؐ

بصد یقین و بصد اعتماد و دیدہ وری
ہے تیری ذات پہ تکمیلِ عظمتِ بشری
ترے وجود پہ فہرستِ انبیا ہے تمام
تجھی پہ ختم ہے روح الامیں کی نامہ بَری
ترے حدُودِ نبوّت، ترا مقامِ نظر!
بتا رہی ہے تری زندگی کی حق نگری
گئی کبھی نہ ترے در پہ سر جھکائے بغیر
سجودِ شوق کی الجھن، جبیں کی دربدری
مرے کریم! مجھے ہے ترا کرم درکار،
مرے مسیح! مجھے ہے تلاشِ چارہ گری
ترے حضور بصد شدم لے کے آیا ہوں
کچھ آنسوؤں کا تلاطم، کچھ آستیں کی تری

بنا لے پھر ہمیں اپنا کہ رحمتِ عالم،
دلوں میں بے خبری ہے دعائیں بے اثری
گرے پڑے ہیں اب ان راستوںمیں دیوانے
جہاں نہ ذکرِ گریباں، نہ فکرِ بخیہ گری
دہائی ہے کہ یہاں بِک رہی ہیں دستاریں
تری شراب کی کرتے ہیں رند پردہ دری
عمل غلام، عبادت غلام، علم غلام،
لطافتوں سے معرّا، بلندیوں سے بری
گناہ و جرم کے سائے میں جی رہے ہیں علوم
زبانِ باخبری پر فسونِ بے خبری!
چمن اُجاڑ کے دنیا سجا رہی ہے مزار
بنا ہوا ہے جنوں اک حجابِ جلوہ گری
ترا بھی ہے یہی منشا تو اے شہِ بطحا!
مجھے قبول یہ کون و مکاں کی دردسری
ترے سوادِ دل و دانش میں کچھ نہیں لیکن
تری رضا ہو تو اک انتقامِ فتنہ گری

سرسیّد کی رُوح سے

بہت کچھ کر چکا ہے انقلابِ آسماں اب تک
تری تعمیر میں لیکن ہے رنگِ جاوداں اب تک
مزاجِ باغباں کو بھانپ کر تو جاگ اٹھا ورنہ
کبھی کے مٹ چکے ہوتے نشانِ گلستاں اب تک!
ہزاروں آندھیاں لاکھوں بگولے آ چکے لیکن!
ترے فانوس ہیں تاریکیوں میں ضَوفشاں اب تک
جسے روشن کیا تھا تیرے سینے کے شراروں نے
نہ ٹھنڈی ہو سکی وہ آتشِ سوزِ نہاں اب تک
بصیرت نے تری بخشی ہیں مستقبل کو قندیلیں
ہوا میں گرچہ آ جاتا ہے ماضی کا دُھواں اب تک
کوئی سوچے کہ جو تیرے عزائم سے اُلجھتے تھے
نہ تو ہوتا تو وہ تاریخ میں ہوتے کہاں اب تک

رہی ہے اس طرح نبضِ تمدّن تیرے ہاتھوں میں
تری تشخیص میں ہے چارۂ دردِ نہاں اب تک،
زمانہ اپنے مرکز سے بھٹکتا ہے بھٹک جائے،
ہے تیرے رہروؤں میں اتّباعِ کارواں اب تک
ہوائے نامُوافق چل رہی ہے گرچہ زوروں سے
خدا رکھّے ہری ہے تیری شاخِ آشیاں اب تک
کچھ ایسے موڑ کاٹے ہیں تری منزل شناسی نے
مثالِ خضر ہیں جو ہیں شریکِ کارواں اب تک
نئے ماحول والے درپئے تخریب ہیں ورنہ
ترے ذرّات میں بیدار ہیں پیشانیاں اب تک
قیادت کا تعصّب مُنکرِ انصاف ہے ورنہ!
ہیں پھیلائے ہوئے دامن تری پہنائیاں اب تک
مگر تاریخ کب تک مسخ ہو گی نوعِ انساں کی
بحمدِ اللہ باقی ہیں ترے کچھ رازداں اب تک

کارواں کا غم

قائدِ اعظم سکونِ جسم و جاں کو لے گیا
جسم و جاں تو کیا نشاطِ دو جہاں کو لے گیا

روح کو آواز دے کر لے گئی روحِ ارم
موت کا سیلاب جسمِ ناتواں کو لے گیا!

باغباں بے دست و پا ٹھہرا، بہاریں بے اثر
ایک ہی جھونکا چمن کے رازداں کو لے گیا

جن منازل کو ترستے تھے خضرؑ کے قافلے
وہ وہاں اپنے گروہِ گمرہاں کو لے گیا!

راہ رو پچھتائیں یا اب منزلیں ماتم کریں
کارواں کا غم امیرِ کارواں کو لے گیا،

بُتکدہ سے حرم تک

(مہاتما گاندھی کے حادثۂ موت کی خبر سُنکر)

غضب ہے رخصتِ ساقی سے میخانے پہ کیا گزری
صراحی کا ہوا کیا حال، پیمانے پہ کیا گزری
چراغِ انجمن سمجھا، نہ اہلِ انجمن سمجھے!
کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پروانے پہ کیا گزری
حرم ششدر ہے اور شیخِ حرم سر در گریباں ہے
یہ کیسا انقلاب آیا، صنم خانے پہ کیا گزری!
یہ پوچھے کوئی اس گردِ غبارِ بے تحاشا سے
کہ دیوانے کے گم ہونے سے ویرانے پہ کیا گزری
میں تنہا کیا ادب دانِ سیاست سب سمجھتے ہیں
کہ یہ عنوان کٹ جانے سے افسانے پہ کیا گزری

جنونِ شوق کا اندازہ فرزانوں سے کیا ہوگا
یہ دیوانے سمجھتے ہیں کہ دیوانے پہ کیا گزری!

اسے کوئی بجز رندوں کے سمجھے بھی تو کیا سمجھے
کہ اُٹھا میرِ میخانہ تو میخانے پہ کیا گزری!

جو پروانوں میں ہمت ہو تو گُل کر دیں چراغوں کو
مگر یہ چیختے پھرتے ہیں پروانے پہ کیا گزری!

ہے اس کی زد میں آبادی بھی ایوانِ قیادت بھی
یہ آندھی تُند رفتاری سے ویرانے پہ کیا گزری

یہ رسمِ انجمن ہے یا تقاضا خونِ ناحق کا!
کہ خود ماتم کُناں ہے شمع پروانے پہ کیا گزری

یہ مرگِ قیس اک دھبّا ہے تاریخِ بیاباں پر!
جو ذرّہ ہے پریشاں ہے کہ ویرانے پہ کیا گزری

مبارک زندگی ہی کو مبارک موت ملتی ہے
عدو بھی کہہ رہے ہیں ہائے بیگانے پہ کیا گزری

اسے دانشؔ مری اجڑی ہوئی آنکھیں سمجھتی ہیں
عزیزانِ گرامی کے اجڑ جانے پہ کیا گزری!

آہ ابوالکلام

عبث گِلہ ہے کسی کو یہاں قرار نہیں
قرار صرف اسے ہے جو مستعار نہیں!

مری نگاہ رخِ ارتقا پہ ہے ہر وقت!
جو آشکار تھے جلوے وہ آشکار نہیں

حیات اصل میں ہے ایک راہِ بے منزل
کہاں ہو صبح کہاں شام، اعتبار نہیں

نہ ہو حیات میں کیوں ماتمِ حیات کا رنگ،
ابوالکلام سرِ بزمِ روزگار نہیں،

یہ ایسی شمع بجھی ہے ارے معاذاللہ
نظر میں صرف اندھیرا ہے رہگزار نہیں

خدا تمہارا نگہباں ہو اے نئی کلیو!!
قیاس اہلِ نظر ہے کہ اب بہار نہیں!

فریب خوردۂ ہستی تو ہوں مگر دانشؔ
بہار کیا مجھے گلشن پہ اعتبار نہیں!

مجاہد

اسے سمجھیں گے کیا نا اہل حاکم نہیں ہے یہ حیاتِ عامیانہ!
لہو سے کھیل کر سوتے ہیں جب یہ ستارے تانتے ہیں شامیانہ
جہاں یہ نصب کر دیتے ہیں خیمے جھکا کر سر گزرتا ہے زمانہ
کرشمہ ہے کرشمہ ان کی ٹھوکر زمیں سے پھوٹ پڑتا ہے خزانہ
سرِ تاریخ یہ اپنے لہو سے! لگا دیتے ہیں مُہرِ جاودانہ

انہیں تعلیم دیتے ہیں صحیفے
نہیں مرتا مجاہد کا فسانہ!

تم

اپنے ماضی کو اگر واپس بھی لا سکتے ہو تم!

حال کے چہرے کا ہر دھبا مٹا سکتے ہو تم!

ملک کس گنتی میں ہے دنیا پہ چھا سکتے ہو تم

گھن گرج توپوں کی چنگھاڑیں دبا سکتے ہو تم!

ہو جو توحید و رسالت پر تمہیں کامل یقیں

غم کے طوفانوں میں گھر کر مسکرا سکتے ہو تم!

تم اگر دوہراؤ اپنے بھولے بسرے زمزمے

موت کے سازوں سے آوازیں ملا سکتے ہو تم

ڈھونڈ لو اپنا اگر کھویا ہوا خُلقِ عظیم

آسماں جاہوں کو قدموں پر جھکا سکتے ہو تم

صدر جمہوریہ کے نام

ایک ناتمام پیغام

اے دلِ جمہور کے حسنِ یقیں، جانِ حیات
پیش کرتا ہے تجھے شاعر خراجِ التفات!

اس میں کیا شک ہے کہ تیرے حاشیے میں بیشتر
جمع ہیں اس ملک کے اہلِ دل و اہلِ نظر!

ہیں مگر ان کے علاوہ بھی ہزاروں آدمی
جانکنی کو جن کی کہتے ہیں عوامی زندگی!!

جن کی شہ رگ کے لہو سے رنگ لیتے ہیں چمن
جن کی حق گوئی کے پہرے دار ہیں دار و رسن

جن کے فاقوں پر یہاں نعمت کدوں کا ہے مدار
جن کی قبروں سے ہے محلوں کی بلندی برقرار

شادیوں میں جن کی شورِ مرگ کا انداز ہے
جن کی بیواؤں کو میلی چادروں پر ناز ہے
زخم کھا کر جن کے ماتھوں پر نہیں آتی شکن
دلہنیں جن کی دُھلے کپڑوں میں رہتی ہیں مگن!
جنگ کا جن میں کوئی چرچا نہ ذکرِ انقلاب
دیتے آئے ہیں جو گردوں کو برابر کا جواب
علم و فن سے بہرہ ور ہوتے نہیں جن کے یتیم
جن کو گرمی میں کوئی سایہ نہ سردی میں گلیم
جن پہ آتی ہے جوانی کرب کے طوفاں لیے
مسکرا سکتے نہیں جن کے گھروندوں میں دیئے
حادثے رکھتے ہیں جن کے عزم و ہمت کو بلند
پھینکتے ہیں جو بزعمِ خود ستاروں پر کمند!
حوصلے جن کے جواں جن کے ۶۰۰ لاکھ استوار
یہ جسے چاہیں اُسی کو بخشتے ہیں اقتدار
جھونپڑوں سے جب یہ میداں میں پکارے جائینگے
صدقِ دل سے شکر کے سجدے گزارے جائینگے

سب یہ واقف ہیں کہ لشکر جنگ سے مرتے نہیں
ولولے تلوار سے دَب کر سفر کرتے نہیں
ہاں مگر جب پھیل جاتی ہے عزائم میں وبا
بیٹھ جاتا ہے سفینہ توڑ کر خود ناخدا
اِن کو عہدوں کی تمنا ہے نہ دولت چاہیئے
صرف محنت کا صلہ حسبِ ضرورت چاہیے
اے امیرِ قوم اے تابندہ دل روشن جبیں
اِن کے حق کو جو نہیں پہچانتا انساں نہیں
وہ تو اک بت ہے جو احساسِ خودی سے دور ہے
موت سے نزدیک تر ہے زندگی سے دُور ہے
اس کی شریانوں میں دل کی روشنی بہتی نہیں
بازوؤں میں جان ہونٹوں میں سکت رہتی نہیں
جب قیادت خستہ حالی پر نظر کرتی نہیں
فطرت اُس خامی پہ ہرگز درگزر کرتی نہیں
پیش بینی سے جو غافل ہے امیرِ کارواں
اس کی قسمت میں نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں!

ہے اگر درکار تجھ کو اپنی عظمت کا دوام
دل میں اپنی قوم کے پیدا کر اپنا اک مقام

داغِ حرماں دامنِ انساں سے دھونا چاہیے
سایۂ خورشید ہر ذرہ پہ ہونا چاہیے

جوشِ طوفاں میں ستونوں سے کہیں چلتا ہے کام
کشتیوں کو گھاٹ پر لا کر لگاتے ہیں عوام!

لمحۂ فکریہ

یہ اب کے رنگِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو
جو گل ہے زخمِ گلستاں ہے دیکھئے کیا ہو

اثر پہ جس کے بھروسہ تھا جس کے ضبط پہ ناز
وہ اشک اب سرِ مژگاں ہے دیکھئے کیا ہو!

رہِ طلب میں ہر گام، کنجِ مرقد تک!
شکستِ شوق کا امکاں ہے دیکھئے کیا ہو

افق پہ چاند نہ گردوں پہ کہکشاں کی نمود
یہ حسنِ شامِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

خبر یہ پھیل چکی ہے کہ دورِ جام یہاں
تدارکِ غمِ دوراں ہے دیکھئے کیا ہو

مجھے بھی موت نے شاید کہیں سے دی آواز
مجھے بھی زیست کا ارماں ہے دیکھئے کیا ہو
مَیں رو رہا ہوں اور اُن کی ہنسی نہیں تھمتی
اب اِس طرح مرا درماں ہے دیکھئے کیا ہو
نہ جانے جا کے کہاں مر گئے ہیں دیوانے
بہار چاک گریباں ہے دیکھئے کیا ہو
حرم کے صحن سے ہُو حق کی شغل گاہوں تک
ہجومِ دَیر نشیناں ہے دیکھئے کیا ہو!
نہ بُتکدوں میں چراغاں نہ میکدوں میں ہجوم
تمام شہر مسلماں ہے دیکھئے کیا ہو
تھا اہتمامِ بہاراں تو لاکھ گھر اجڑے
اب احتمالِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو
تھا جن کی دید پہ احسانِ زندگی کا مدار
نگاہ اُن سے گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو

دوگانہ کا تقاضا

اگرچہ جبر ہے یہ جاگتے عزائم پر
نمازِ عید تو پڑھنے کو جاؤں گا پھر بھی
یہ رسم ہے تو مرے ہمنشیں قبول مجھے
خوشی بصد غم و حرماں مناؤں گا پھر بھی
کہیں بزرگ بتائیں نہ بے اصول مجھے
مجھے بھی ہے یہ تمنا کہ قہقہے برساؤں
مگر نشاط مری بے دلی میں مدغم ہے
مری بہشت یہی ہے مرا ارم ہے یہی
کہ میرے سینے میں احساس کا جہنم ہے
مری حیات مری موت کا بھرم ہے یہی

مری نگاہ امیروں کی موٹروں پہ نہیں
مری نگاہ میں رستے کا ہر سوالی ہے!

مری نگاہ میں جاہ و حشم ہے بے قیمت
مری نظر میں یتیموں کی خستہ حالی ہے

متاعِ سوز سے خالی ہیں صاحبِ ثروت
مرے خیال میں ویران آشیانے ہیں

شبابِ گل پہ خیالات کس طرح جائیں
مَیں بے شعور اکابر کے ٹھاٹھ کیا دیکھوں

مری نگاہ میں ہیں خستہ حال بیوائیں
میں تا بہ کَے یہ شدائد کی انتہا دیکھوں

مَیں ایک فاقہ کشوں کا نشان بر ہوں بھلا
ملے گا کیا مجھے جا کر فراخ دستوں میں

میں اس سماج کے نو دولتوں کو کیا جانوں
مرا خیال تو غلطاں ہے فاقہ مستوں میں

بہک کے صنعتِ آذر کو کیوں خدا مانوں؟

ہیں میرے کانوں میں آہیں ستم رسیدوں کی
لگاؤ کیسے ہو نغمات و رقصِ پیہم سے
مجھے خواص کے جلسوں سے واسطہ کب تھا
مجھے کہاں ہے فراغت عوام کے غم سے
غمِ وفا کے سوا دل کا آسرا کب تھا
یہاں جو آبلہ پا ہے وہ ہے مرا محبوب
نظر ہو خاک رسا اوجِ کجکلاہی پر
کہ میرے سینے میں پرتو فگن ہے مستقبل
میں اشک ریز ہوں مزدور کی تباہی پر
مَیں جانے کب سے اسی انجمن میں ہوں شاملِ
ہے میری روح تو بہتے ہوئے پسینوں میں
جچے نگاہ میں کیا جامِ بادۂ گلفام؟
بلا رہے ہیں زمیندار ٹھیکہ داروں کو
میں سوچتا ہوں کسانوں کو کیسے دوں پیغام
بدل رہے ہیں یہ خاروں میں مرغزاروں کو

مری نظر ہیں غریبوں کے تن کی عریانی
تجھے یہ شوق سجے کیسے بزمِ نام و نمود؟
ترا خیال نئی فلم چل کے دیکھیں گے!

مجھے یہ غم کہ مدارس میں علم ہے مفقود
مرے عوام مسائل کو کیسے سمجھیں گے؟

مجھے یہ فکر کہ پونچھوں میں قوم کے آنسو
تجھے یہ شکوہ تبسّم میں اعتدال نہیں
تری نظر میں امیروں کی فربہ اندامی

مجھے خلش کہ غریبوں کا ہسپتال نہیں
بڑی ہے اس میں ندامت بڑی ہے بدنامی

میں سوچتا ہوں مرے ملک کا مآل ہے کیا
ترا مذاق تو یاروں کی رنگ رلیاں ہیں
معاشرہ کی خرابی ارے معاذ اللہ

قدم قدم پہ ہلاکت کی چور گلیاں ہیں
کہیں نہیں ہے شریفوں کی زندگی کو پناہ

نمازِ عید میں پڑھنے کو جاؤنگا پھر بھی خوشی بصد غم و حرماں مناؤنگا پھر بھی

ہم نہیں سمجھے!

دِل آزاری یہاں دستور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
محبّت سے ہر اِنساں دُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جو کل آیا تھا بیدم ہو گے شعلوں کے سمندر سے!
وہ دِل فریاد سے معمُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
الٰہی بیکسوں سے فاقہ مستوں سے یتیموں سے
ترے بندوں کی شفقت دُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
مُسلمانوں نے کیوں قرآن کو سمجھا ہے صِرف اپنا
کتابِ زندگی محصُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

زبانوں پر حدیثیں ہیں کُھلے ماتھوں پہ محرابیں،
دِلوں میں خُبث کا ناسُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ضرُورت مند بے تہذیب و بے توقیر ہیں لیکن!
ہر اک کرسی نشیں مغرُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
اگر محنت سے دنیا میں بدل سکتی ہیں تقدیریں
زبوں حال اس قدر مزدُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
وہ کاریگر، ہے خالق کے مُقلِّد کا گُماں جس پر،
خراب و خستہ و رنجُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جواب آہوں کا ایوانِ حکومت سے نہیں آتا!
دِلوں سے عرش اِتنی دُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جب اک دستورِ فطرت کے سبھی ہیں ماننے والے
بہ ہر منصب جُدا دستُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
غریبوں کا لہو جن جن کی خوراکوں میں شامل ہے!
انہیں چہروں پہ رنگ و نُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جسے قُدرت نے بھیجا دور رس فکر و نظر دے کر
وہی انساں یہاں مقہُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

امیرِ کارواں زیرک ہے عزمِ کارواں محکم !
مگر منزل ابھی تک دور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
رذالت کے لئے الطاف ہی الطاف کیا معنی ؟
شرافت بے کس و مجبور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
حسد کی رَو، تعصّب کی وَبا، آزار کا چسکا ! !
وفا کے نام سے مشہور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جرائم دیکھتی آنکھوں نمو پاتے ہیں، بڑھتے ہیں !
عدالت عدل سے معذور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
چمن سے جا چکے صیّاد گلچیں ہو چکے رخصت
مگر اب تک وہی منشور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ابھی تو ہوش بھی آیا نہیں غربت کے ماروں کو
تباہی پھر وہی منظور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے !
دلِ احساں دانش پر ہیں کیوں ضربیں دو عالم کی
اسی کا جام چکنا چُور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے !

تحریکِ غدر سنہ ۱۸۵۷ء

تحریک، جس کو غدر بتاتے ہیں چند لوگ
دانشؔ مجھے وہی ہیں بہت ناپسند لوگ
وہ تو بصد خلوص و بہ احساسِ خود نگر!
آزادیٔ تمام کی کوشش تھی سر بسر
سازش سے توڑ دیں کی جو ناکام ہو گئی،
جلووں کی پَو پھٹی بھی نہ تھی شام ہو گئی
پھسلے تھے کون اور کہاں تک بہے ہیں ہم!
سو سال تک اسیرِ غلامی رہے ہیں ہم
کچھ لوگ آج بھی ہیں اسی طرح کے اصیل
عیش و طرب کی جن کے حکومت ہے، خود کفیل
چہروں پہ سی لیا ہے وفا کے نقاب کو
آواز دے رہے ہیں نئے انقلاب کو

حرفِ چند

احسان دانش صاحب سے میرے دیرینہ مراسم ہیں اور ان کے ادبی ذوق کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ اردو زبان اور محاورے پر ان کی دسترس کسی توصیف کی محتاج نہیں، زندگی کے تلخ حقائق کو وہ بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اس سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے اشعار میں ان کا اظہار کرتے ہیں، خدا نے ان کو آواز بھی ایسی دی ہے جو اس شدتِ اظہار کی متحمل ہو سکتی ہے اور جس کی وساطت سے سامعین کے دل پر ان کے جذبات نقش ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے کئی مرتبہ سنا اور ہمیشہ اس سے متاثر ہوا۔

یہ کتاب بھی جس کے تعارف کی غرض سے میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں جنابِ احسان دانش کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دس برس تک انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے ان کے دل نے محسوس کیا اور پھر اس احساس نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنائیں، وہ ایک باکمال شاعر ہیں اور شاعر کے تخیلات اور تصورات کے اظہار کے لیے شعر ہی ایک موزوں وسیلہ ہے۔ اس نظم میں انہوں نے نہ صرف اس المناک صورت حال کی تصویر کھینچی ہے جس کو بدلنے کی انقلاب کے سوا انہیں کوئی اور صورت نظر نہ آئی، مگر خدا کا بڑا شکر ہے کہ انقلاب کی جو ہولناک تصویر ان کے شاعرانہ تصور نے دیکھی، اس سے ہمارا مستقبل محفوظ رہا

انقلاب آیا تو ضرور مگر اللہ کی رحمت بن کر آیا، ایک ایسی رحمت جس نے ہم پر ہزاروں رحمتوں کے دروازے کھول دیئے اور جن آفتوں کا اندیشہ جناب احسان دانش کو تھا ان کا سدِ باب ہو گیا۔

بہرحال یہ نظم ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے پہلے لکھی گئی تھی اور احسان دانش صاحب نے اس کے کچھ بند مجھے اس زمانے میں بھی سنائے تھے اس لیے یہ بات قابلِ قدر ہے کہ اس وقت جب سب لوگ اسی صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے جسے اس گوشہ نشیں شاعر نے دیکھا اور جب کسی کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے اسے بیان کرے تو یہ جرأت انہیں کو میسر آئی کہ اپنے جذبات کا اظہار صاف صاف الفاظ میں کر دیں۔

اب جبکہ انقلابی حکومت کی بدولت فتنہ و فساد کے وہ سب امکانات دور ہو گئے ہیں جن کا اس نظم کے مصنف کو اندیشہ تھا لازم ہے کہ ہم ان تلخ حقائق کا بڑی بصیرت سے مطالعہ کریں، جن کا ذکر اس نظم میں کیا گیا ہے اور اس بات کا تہیہ کر لیں کہ ہمارے ملک میں اب وہ عوارض کبھی رونما نہ ہونے پائیں گے جن کا دردناک خاکہ جناب احسان دانش نے اس نظم کی ابتدا میں کھینچا ہے اور جن کا علاج ایسے ہی انقلابات ہوا کرتے ہیں جن سے اللہ کے فضل و کرم سے ہم محفوظ رہے۔

جو وقت نزدیک آ رہا ہے

(پیش بینی)

دل اب وہ پہلا سا دل نہیں ہے نظر وہ پہلی نظر نہیں ہے
لبوں سے نغمات ہیں گریزاں، دعائیں بر نگِ اثر نہیں ہے
سکوں کوئی معتبر نہیں ہے تڑپ کوئی کارگر نہیں ہے
خودی کی چھوٹ ہما ہمی ہے یہاں کوئی مسنوِ دنگر نہیں ہے
شریف انساں کا اس فضا میں کسی طرح اب گزر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اگرچہ ہیں گرد و پیش قبریں، مگر میں تقریر کر رہا ہوں
مجھے جو القا سا ہو رہا ہے تڑپ کے تشہیر کر رہا ہوں
یہ دورِ حسن خواب میں ہے غلط اُسی کی تعبیر کر رہا ہوں
میں اپنے شعر و ادب سے اپنے وطن کی تعمیر کر رہا ہوں
مرے تصوّر میں اس سے بڑھ کر اصولِ عرضِ ہنر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

مجھے تو تاریخ کے تقاضے عجیب منظر دکھا رہے ہیں
کہیں دھواں دے رہے ہیں سورج کہیں فلک لڑکھڑا رہے ہیں
نگاہ میں ارتقا کے خونیں چراغ چکر لگا رہے ہیں
جو یہ سماں دیکھتے نہیں ہیں وہ طنز سے مسکرا رہے ہیں
مگر وہ کس طرح مسکرائے سکوں جسے رات بھر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

سکوں کسے بخشتی ہے دنیا سکوں کا کیا انتظار کیجے؟
یہاں نہیں غمگسار کوئی یہاں کسے غمگسار کیجے؟
ہے عقل چکر میں اس فضا سے شعار کیا اختیار کیجے؟
اُتار دیتا ہے دل میں خنجر جسے ذرا دل سے پیار کیجے
کہاں کا رشتہ کہاں کا ناتا یہاں کوئی معتبر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

کچھ ایسی دریا نے لی ہے کروٹ کہ روز طوفاں اٹھا کریں گے
فضا بگولے جنا کرے گی جنوں کے جھکڑ چلا کریں گے
مگر وفا کے حلیف جس حال میں رہیں گے وفا کریں گے
ہم آدمی کے بھلے میں خوش ہیں ہم آدمی کا بھلا کریں گے

ہمارے سینے میں صاف دل ہیں تو صاف کہنے میں ڈر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہماری فطرت کا یہ تقاضا کہ زلفِ تہذیب کو سنواریں
فضائے حاضر کی یہ تمنا کہ مر بھی جائیں تو دم نہ ماریں
عجیب اک کشمکش ہے طاری کہ کس طرح زندگی گزاریں
الگ الگ گھٹ کے رہ رہے ہیں کسے بلائیں کسے پکاریں

یہاں تباہی کا ساز و ساماں کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

میں ریڈیو روز سُن رہا ہوں، میں روز اخبار دیکھتا ہوں
ہر اک جریدہ کی پشت پر سیم و زر کے انبار دیکھتا ہوں
صحافیوں کے دل و نظر کو خفیف و نادار دیکھتا ہوں
زبان و افکار بک رہے ہیں قلم کے بیوپار دیکھتا ہوں
قلم کا بیوپار کرنے والا کوئی بھی ہو مفتخر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہے ننگِ اخلاق یہ تجارت، ہے جرم ایسی دکانداری
حلال روزی سے ان کو ضد ہے شکار گاہک ہیں یہ شکاری
نہ اجنبیت کی کچھ رعایت نہ دوستی ہی کی پاسداری
گراں فروشی سے کچھ جھجک ہے نہ سودِ بیجا پہ شرمساری
لگے جو گاہک تو خود فروشی سے بھی انہیں کچھ حذر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہے اجنبیّت تو اجنبیّت، یہاں تو ہے دوستی میں رشوت
ذرا مرے سامنے تو آئے نہیں ہے جس زندگی میں رشوت!

احاطۂ خانقہ میں نذریں، احاطۂ دفتری میں رشوت
غرض نہیں کوئی ایسا شعبہ جہاں نہیں نوکری میں رشوت

نہ جس پہ پگڑی کا شبہہ گزرے یہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

مٹے جن زمینوں میں لالۂ و گل وہاں فقط خار بس رہے ہیں
نگاہ جس سمت جا رہی ہے بلا کے عیّار بس رہے ہیں

جفا کے خوگر، وفا کے دشمن، وطن کے غدّار بس رہے ہیں
ذلیل، ملّت فروش، ارباب کُش، ریاکار بس رہے ہیں

تمام یہ آج کے جواری ہیں کل پہ ان کی نظر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

یہاں تو ہر چیز ہے تخالص وہ جانور ہے کہ آدمی ہے
کہیں اندھیرا ہے روشنی میں، کہیں اندھیرے میں روشنی ہے
دوائیں ہوں یا غذائیں ہر شے جو بک رہی ہے وہ دوغلی ہے
یہاں لقب زندگی ہے جس کا وہ اک بالا قساط خودکشی ہے

عوام دن رات مر رہے ہیں خواص پر کچھ اثر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

نئے امیروں میں کر دیا ہے نئی روش نے غرور پیدا
یہی ہیں وہ جن کی ہوس مندی کے بطن سے ہے سرور پیدا
انہیں کے دم سے ہے ہوٹلوں میں تمام تر رنگ و نور پیدا
یہ جس محلے میں ہیں وہاں قحبگی ہے نزدیک و دور پیدا
یہ جتنے ہیں ان میں کوئی ہمسایوں کے لئے بے ضرر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جہاں میں اشراف پس رہے ہیں کہ ہو گئے بے شمار غنڈے
لگے جو موقع تو لوٹ لیتے ہیں روک کر رہگزار غنڈے
بلند منصب کے دوست قاتل، حریص طاقت کے یار غنڈے
جو اس طرف دو ہزار لقّے تو اُس طرف دو ہزار غنڈے ہے

نظام کی سب خرابیاں ہیں یہ بات حالات پر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

جو اہلِ زر ہیں وہ غیر ملکوں میں لے گئے کاروبار اپنا
ہمارے سونے کو جانتے ہیں یہاں کے سرمایہ دار اپنا
بایں خیانت یہاں بھی لوگوں میں چاہتے ہیں وقار اپنا
زمانہ بدلا کرے مگر یہ نہیں بدلتے شعار اپنا

ہے کون ان میں مدارِ حبس کا عوام کے خون پر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

غلط کہ تنظیمِ نو کی خاطر کوئی زمانہ نہیں ملا ہے
خراب ہیں لوگ دس برس سے کوئی ٹھکانہ نہیں ملا ہے
جھکا کے سر جس جگہ سکوں ہو وہ آستانہ نہیں ملا ہے
جہان چھانا ہے لیکن ایسا قمار خانہ نہیں ملا ہے

ہے دین دنیا میں کون سی شے جو اس جگہ داؤں پہ نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اُس کی خبر نہیں ہے

کہیں شریف افسروں کو رکھتی ہے بے سکوں رہبروں کی خامی
کہیں کلرکوں کے علم میں ہے غلط قدم افسروں کی خامی
کہیں ہے محسن کشوں کے ہاتھوں میں سادہ خاطر گھروں کی خامی
تمام تر خامیوں کی بنیاد میں ہے دانشوروں کی خامی

جہاں نہ تعلیم کام کی ہو وہاں فلاحِ بشر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جہاں صداقت ہے، شرطِ منزل وہیں سے یہ بچ کے چل رہے ہیں
تمام سیّاس گرگٹوں کی طرح سے رنگت بدل رہے ہیں
زبوں مقاصد کی گندگی میں وبائی امراض پل رہے ہیں
بہت جنازے نکل چکے ہیں، بہت جنازے نکل رہے ہیں
مگر یہاں سب کے دل ہیں پتھر کسی پہ کوئی اثر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہیں یوں تو ہونے کو مدرسے بھی جگہ جگہ ہسپتال بھی ہیں!
مگر میں یہ پوچھتا ہوں اُن میں کہیں پریشان حال بھی ہیں؟
عوام کے ان اہم اداروں میں صاحبانِ کمال بھی ہیں؟
شفا کدوں اور مدرسوں میں غریب ماؤں کے لال بھی ہیں؟
یہاں قیادت ہے جانکنی میں مگر کوئی چارہ گر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جو فرض کو فرض جانتے ہیں، جو غور سے کام کر رہے ہیں
بڑے تماشے کی بات یہ ہے وہ اُس کا تاوان بھر رہے ہیں
مگر جو رشوت میں کھیلتے ہیں نکھر رہے ہیں سنور رہے ہیں
تمام ابنائے وقت اپنی حدوں کو چھو کر گزر رہے ہیں
سمجھ لیا اس جہاں سے آگے کوئی جہانِ دگر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

یہاں ہے نیلام کی ہر اک شے یہاں محبت بھی بک رہی ہے
یہاں ہیں عصمت فروشیاں بھی یہاں شرافت بھی بک رہی ہے
یہاں تو ہے علم کی بھی آڑھت یہاں تو صحت بھی بک رہی ہے
یہاں وزیروں کی بھی ہے قیمت یہاں وزارت بھی بک رہی ہے
درون بینی کا سب کو دعویٰ مگر کوئی دیدہ ور نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اشارے جو کر رہے ہیں نائب انہیں پہ حکام چل رہے ہیں

جہاں جہاں بات رک رہی ہے وہیں وہیں دام چل رہے ہیں

کہیں ہیں مصروفِ کار عامل کہیں فقط نام چل رہے ہیں

بڑے بڑے کام رک رہے ہیں بڑے بڑے کام چل رہے ہیں

خدا کی طاعت وطن کی خدمت کسی کے پیشِ نظر نہیں ہے

جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جو سن رہا ہے وہ دم بخود ہے جو دیکھتا ہے وہ کہہ رہا ہے

کہ یہ سفینہ ہوا کے بالکل خلاف دھارے پہ بہہ رہا ہے

لپٹ رہی ہیں مہیب موجیں ہوا کے یلغار سہہ رہا ہے

ہے جوش پر جہل کا سمندر شعور کا چاند گہہ رہا ہے

ہے سامنے شہر تیتوں کا مگر کوئی آنکھ تر نہیں ہے

جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جہاں کے قابل جو آدمی ہیں وہ اپنے منصب سے دُور تر ہیں
بصیرتوں کے مقام جو ہیں وہاں فقط صاحبِ اثر ہیں
ہیں احتساب ان کے پستیوں تک بلندیوں سے یہ بےخبر ہیں
علاج تلووں کا ہو رہا ہے نظر سے پوشیدہ زخم سر ہیں
جنوں پہ فالج گرا ہوا ہے خرد یہاں معتبر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اگر اندھیروں کو ہم سے کد ہے تو کیا سلامی ادا کریں ہم؟
تباہیوں کو قبول کر لیں خودی کو اپنی فنا کریں ہم؟
اذاں کے ہونٹ کاٹ ڈالیں ضمیر کو بے حیا کریں ہم؟
ہماری فطرت چراغ سازی ہے اس اجالے کو کیا کریں ہم
یہاں تو ذہنوں کے کارخانوں میں روشنی کا گزر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہیں ٹھوکریں تو قدم قدم پر سکوں کی صورت کہیں تو ہوتی
اگرچہ کانٹوں کی نسل چلتی، گلوں کی خاطر زمیں تو ہوتی
بلا سے مدّت میں زخم بھرتے حیاتِ نَو بالیقیں تو ہوتی
ہیں آنسوؤں کے ہزار جھالے، نصیب اک آستیں تو ہوتی
مگر کہاں، توبہ توبہ کیجے ادھر کسی کی نظر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

بجا کہ ہے بدترین حالت، نگاہ غایت پہ کون ڈالے
کہ پستیوں میں اُتر چکے ہیں بُرے بھلے کو سمجھنے والے
جرائم آزاد ہیں بہ ہر سُو، ہے کس کی ہمّت کہ ہاتھ ڈالے
روایتوں میں مری پڑی ہے زبانِ قانون میں ہیں تالے
جو اس بپھرتے جنوں کو روکے ابھی یہاں وہ بشر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جو ہے وہ اپنی ہی ہانکتا ہے کہیں کوئی فیصلا تر ہوتا
لگام منہ سے نکال پھینکی تھی، پاؤں میں سپنکڑا تو ہوتا
وطن پرستوں کا جتنا اثیار ہے کہیں تذکرا تو ہوتا!
جسے پرکھتے وہ ٹھس نکلتا ہے کوئی سکّہ کھرا تو ہوتا

یہ رات جاتے گی بھینٹ لے کر کہیں نمودِ سحر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آرہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

مدد ہو یا بھیک لطف جب ہے عوام پہ بے اثر نہ نکلے
سکونِ طبقات ہو کے برہم بہ عزمِ تیغ و تبر نہ نکلے
مجھے تو یہ فکر ہے یہ نسخہ مخالفِ چارہ گر نہ نکلے
وہی جنوں جس کو روکتے ہیں خرد سے تردیک تر نہ نکلے

خرد کی پرواز کو جو روکے مجالِ دیوار و در نہیں ہے
جو وقت نزدیک آرہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

یہ کوئی معیارِ زندگی ہے کہ پیشِ قوّت جبیں جھکا دیں
اگر اشارہ ملے ذرا سا تو سامنے عصمتوں کو لا دیں
جو کچھ ترقی کی ہوں اُمیدیں تو بڑھ کے بامِ حرم کو ڈھا دیں
جو سر اُڑانے سے کام نکلے تو بے پس و پیش سر اُڑا دیں
قدم قدم پر ہیں جرم و عصیاں مگر کوئی داد گر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
خرابیاں ہیں پولس میں لیکن نظام برہم نہیں ہوا ہے
عدالتِ عالیہ کا معیار جو بھی تھا کم نہیں ہوا ہے
وطن فروشی کا اِن اداروں میں خیر مقدم نہیں ہوا ہے
جواب دے دیں جہاں اطبّا ابھی وہ عالم نہیں ہوا ہے
ہو جس میں سرسام کا بھی امکاں نہیں وہ دَورانِ سر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

عوام کا ظرف کم نہیں ہے مگر یونہی حسنِ ظن کہاں تک؟
بساطِ گُل رُوندتے رہیں گے یہ دشمنانِ چمن کہاں تک؟
وطن کی دامن دریدگی پر جبیں گے ننگِ وطن کہاں تک؟
پکارتے ہی رہیں گے آخر ہمیں یہ دار و رسن کہاں تک؟

کہ ہم سے دیوانگانِ الفت کا سلسلہ مختصر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

کبھی جو آسودگی طلب کی تو لُٹ گئے بانکپن ہمارے
ذرا جو ذکرِ بہار چھیڑا تو جل گئے ہیں چمن ہمارے
کبھی جو ہم نے لباسِ ماتم اُتر گئے ہیں کفن ہمارے
مگر ابھی لہلہا رہے ہیں یہ دست و بازو کے بن ہمارے

یہ دست و بازو کے بن ہیں قائم تو کوئی خوف و خطر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہے آج بیمار کھیتیوں کا مچان دار الاماں ہمارا
مگر انہی بنجروں سے اُبھرے گا ایک دن گلستاں ہمارا
پہنچ گیا منزلوں پہ جس دن لُٹا پٹا کارواں ہمارا
ستارے لے کر اُتر پڑے گا زمیں پہ آسماں ہمارا

کہ ہم ستارہ شکار لوگوں کی پستیوں پر نظر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آرہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہمارے چہروں کی سرخیاں ہیں نشاں ہمارے علم ہمارے!
ہمارے ماتھے کی سلوٹوں میں پکارتے ہیں بھرم ہمارے!
ہیں ثبت تاریخ نَو کے سینے میں آج نقشِ قدم ہمارے!
فضاؤں کی دھند صاف کر دی یہ کارنامے ہیں کم ہمارے؟

یہاں جو دیکھو تو دس برس میں نصیب اک راہبر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آرہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

۱۰۱۸۴

اگرچہ مزدور دم بخود ہیں، کسان گردوں کو تک رہے ہیں
ضمیر صبح و مسا میں رہ رہ کے سُرخ کوندے لپک رہے ہیں
دلوں میں لاوے ابل رہے ہیں مواد سینوں میں پک رہے ہیں
زمیں کی پھولی ہوئی ہیں سانسیں ملوں کے سینے دھڑک رہے ہیں
ذرا کہیں سے اٹھا جو غوغا تمام یہ شور و شر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

نہ جانے کس دن عوام بگڑیں خواص ظلم و ستم بڑھا دیں
نہ جانے کس دن یہ جھونپڑوں کے مکین محلوں کو لڑکھڑا دیں
نہ جانے کس دن غریب گاہک دکان داروں کا زعم ڈھا دیں
نہ جانے کس دن خموش فوجیں نظامِ نو کا علم اٹھا دیں
نظامِ نو کا جو سیل رو کے مجالِ دیوار و در نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جہاں جہاں بھوک حکم دے گی وہیں وہیں انقلاب ہو گا
جلالتوں سے صفیں لگیں گی شقاوتوں سے عتاب ہو گا
نگر نگر قتل گاہ ہو گی، ڈگر ڈگر خونِ ناب ہو گا
اضافہ بیواؤں اور یتیموں میں ہو گا اور بے حساب ہو گا

زمیں کے مالک ہوں یا ملوں کے کسی کو اس سے مفر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

کسی کے سینے میں جوش بھی ہے کسی کے دل میں امنگ بھی ہے؟
روا ہے انساں کو خونِ انساں، یہ کوئی جینے کا ڈھنگ بھی ہے؟
محل مقابر بنے ہوئے ہیں زمیں غریبوں پہ تنگ بھی ہے؟
فضا کے تیور بتا رہے ہیں کہ اب تو امکانِ جنگ بھی ہے!

انہیں نہیں یہ خبر کہ میدانِ جنگ خالہ کا گھر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

یہاں جو انسان اینڈتے ہیں یہاں وہ انساں نہیں رہیں گے
وفا کی مہلت نہیں ملے گی جفا کے امکاں نہیں رہیں گے
یہ جنّتیں منہ کے بل گریں گی یہ قصر و ایواں نہیں رہیں گے
مسہریوں پر پڑے گا ملبہ یہ ساز و ساماں نہیں رہیں گے

جو سر ملا ہے تو دھڑ ہے غائب جو دھڑ ملا ہے تو سر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

جدھر کو چاہے گی مرد و زن کو چلائے گی رائفل کی گولی
شباب نیلام پر چڑھیں گے ، لگے گی لاوارثوں پہ بولی
اُدھیڑ دیں گے بدن کو چابک اگر کسی نے زبان کھولی
ضعیف کاسہ لیے پھریں گے ، گلے میں بچّوں کے ہو گی جھولی

اگرچہ بارود کا دھواں تک ابھی سرِ رہگذر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

ہر ایک سینے میں شعلہ افروز صرصرِ انتقام ہو گی !!

جنوں کا خونی شباب جھلّائے گا خرد بے لگام ہو گی
جو آج سکّوں کی صبح زرّیں ہے کل دھواں دھار شام ہو گی
سہاگنوں کے جلے سہاگوں کی راکھ گلیوں میں عام ہو گی

جبیں پہ سورج کی پڑ چکے بل نظر اٹھاؤ سحر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

وطن کا سودا چکانے والے وطن کا سودا چکا چکے ہیں
مگر انہیں ہوش آ رہا ہے جنہیں یہ احمق بنا چکے ہیں
جو دھول رستوں میں اڑ رہی تھی لہو کے چھینٹے دبا چکے ہیں
جو چند مینار فاصلوں پر تھے اب وہ نزدیک آ چکے ہیں

انہیں گرانا انہیں مٹانا، یہ کام دشوار تر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

غرض "سول دار" ہو کہ کوئی یہیں سے اُٹھ کر بگل بجائے
قریب تر آ گئی وہ ساعت کہ ان درندوں کو ہوش آئے
بُری ہے مظلوم کی خموشی، رہے گی کب بے اثر دکھائے
لپیٹ پڑیں گے جنوں کی بھوتوں کی طرح انکو انہیں کے سائے
عذاب ہوتا ہے جب یہ نازل کوئی مقامِ مفر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

اگر مناسب خیال کرتے ہو، امن کا اہتمام کر لو!
زبوں نظامی اگر غلط ہے درست اپنا نظام کر لو!
جو پالیسی میں نہ فرق آئے تو ملک کا انتظام کر لو!
تمہیں پہ اب فیصلہ ہے اس کا مٹو! کہ خود کو دوام کر لو!
یقین کر لو کہ زندگی میں کوئی عمل بے ثمر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

میں خوب واقف ہوں شاعری کی ملے گی دانش جو داد مجھ کو
گلی گلی میں کریں گے رسوا یہ صاحبانِ مفاد مجھ کو
قرار دے دیں گے چند نااہل مل کے اصلِ فساد مجھ کو
مگر خدا ہے گواہ میرا نہیں کسی سے عناد مجھ کو

میں جس کا پیغامبر ہوں لیکن اس کے کوئی پیغامبر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

آرام کا یہ ہنگام نہیں

(گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں پڑھی گئی)

اس دورِ زبوں کا نام ہے کیا گردش کے اگر ایام نہیں؟
آلام نے رستے روکے ہیں دنیا کو کہیں آرام نہیں،
امید کی کوئی صبح نہیں، تسکین کی کوئی شام نہیں،
جسموں کے لئے سو افسوں ہیں روحوں کے لئے پیغام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

بے نور ہر اک پیشانی ہے تاریک ہر اک آئینہ ہے
اخلاق ابھی تک کوڑھی ہے، انصاف ابھی نابینا ہے
یہ زخم ابھی کچھ کھانے ہیں، یہ زہر ابھی کچھ پینا ہے
آوازِ شکستِ جام تو ہے احساسِ شکستِ جام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

غمناک اندھیرا چھایا ہے ہستی کی تجلّی گاہوں میں
ناپید خودی، معدوم خدا، کٹتے ہیں مسافر راہوں میں
بازار میں ڈاکو بیٹھے ہیں، لٹتی ہے رعایا شاہوں میں
دنیا کی نگاہِ بدبیں میں آغاز تو ہے انجام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

تکفیر کو زینت دے دے کر ادیان بگاڑے جاتے ہیں
عِصمت کی دکانیں سجتی ہیں، ایمان بگاڑے جاتے ہیں
عُہدوں کی جھلک دکھائی ہے انسان بگاڑے جاتے ہیں
شیطان کی جتنی چلتی ہے اللہ کا اتنا نام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

کہتے ہیں زعیمِ قوم جنہیں لاکھوں پہ جو تنہا بھاری ہیں!
ایمان کے اونچے تاجر ہیں ملّت کے بڑے بیوپاری ہیں
انصاف کے منصب داروں میں کچھ پوچ ہیں کچھ درباری ہیں
آمد سے مصارف لاکھ گنا رشوت کا مگر الزام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

نغموں کے حسیں دیباچوں میں قرآن بھی گایا جاتا ہے
بے رُوح نمازیں پڑھ پڑھ کر نعرہ بھی لگایا جاتا ہے
اخبار کی جعلی خبروں کو الہام بتایا جاتا ہے
اسلام کے دعویداروں میں سب کچھ ہے مگر اسلام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

ہڑکائے درندے بیٹھے ہیں ہر شہر کی چلتی راہوں میں
پیری میں ریاست بنتی ہے، اٹھتے ہیں محل تنخواہوں میں
قرآن پہ رعشہ طاری ہے، بکتا ہے خدا درگاہوں میں
شمشیر کا وقت آ پہنچا ہے، تقریر و قلم کا کام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

انساں کا شکاری انساں ہے دن رات اسی کا رونا ہے
مزدور کی چربی چاندی ہے، دہقان کی ہڈی سونا ہے
تہذیب کے گیلے دامن سے اس داغ کو جلدی دھونا ہے
ظاہر میں یہ پھوڑا سرخ سہی۔ اندر کا مواد اب خام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

دولت کے محافظ سانپوں کو بانبی میں نہ چھوڑا جائے گا
قبروں میں دریچے کھولیں گے، مُردوں کو جھنجھوڑا جائے گا
گمراہ عدالت گاہوں کے قانون کو توڑا جائے گا
حاکم جو رعایا دشمن ہیں دجّال ہیں وُہ حکام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

کب تک یہ جواری جیتیں گے، کب تک یہ جماعت لوٹے گی؟
مزدور کے میلے ہاتھوں سے زنجیرِ تشدّد ٹوٹے گی
دہقان گلے جب کاٹیں گے ماتھوں پہ کرن سی پھوٹے گی
مرنے سے حسیں اب فرض نہیں، بچنے سے بُرا اب کام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

وُہ دیکھ زمیں کے سینے پر طوفان نے پرچم کھولا ہے
ہر سمت سے نیلی آندھی نے گلزار پہ دھاوا بولا ہے
خوں ریز شفق کی سرخی نے گردوں پہ لہو سا گھولا ہے
اُمڈے ہیں عقابوں کے بادل بلبل کا چمن میں نام نہیں!
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

رفتار میں تیزی بھرتا جا مت پوچھ کہاں تک جانا ہے
تدبیر سے خدمت لینی ہے، تقدیر پہ قابو پانا ہے
طوفاں کو شکستیں دینی ہیں، دریاؤں کا غرّہ ڈھانا ہے
دریاؤں کا غرّہ ڈھا دینا ہر شخص کے بس کا کام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

پستی سے بپھر کر اُٹھے ہیں، گردوں پہ گرجتے جائیں گے
اس موڑ کے بعد اب منزل ہے آزاد ترانے گائیں گے
سوئے تو بہت کچھ کھوئیں گے، جاگے تو سبھی کچھ پائیں گے
آ ذوقِ شہادت عام کریں اب ذوقِ شہادت عام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

ہم حق کی پرستش کرتے ہیں باطل کو نہ ہرگز مانیں گے
توحید کو قائم رکھیں گے، انسان کا حق پہچانیں گے
تکلیف کو راحت سمجھیں گے مرنے کو شہادت جانیں گے
زنداں سے بڑی توقیر نہیں، پھانسی سے بڑا انعام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر آرام کا یہ ہنگام نہیں

میرا وطن سو رہا ہے

رات گزری سحر مسکرانے لگی
چونک اُٹھی آبِ گل کی حسیں انجمن
ذرّے ذرّے کے ہونٹوں پہ آئی ہنسی
جھلملانے لگی ٹھیکروں پر کرن
جاگ اُٹھے جھونپڑوں سے محلّات تک
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن

گھونگھٹوں کو الٹنے کی کوشش میں ہے
پنگھٹوں پر اُجالے جگاتی پون
گاگروں کے تلے سادہ چہروں پہ ہے
آسمانوں سے اُترا ہوا بانکپن!
پتّے پتّے پہ سورج نے دیں دستکیں
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن

دُور دُور اب دھندلکوں کے ریوڑ نہیں
سبز کھیتوں پہ ہے اک حسیں بھولپن
باکھ پَو سا رہی ہے ہوائے سحر!
دُودھ برسا رہے ہیں شعاعوں کے تھن
نغمتیں کھٹکھٹاتی ہیں آ آ کے در
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن

ٹھیکیدار اپنے دُھنّوں میں ہیں شادماں
اور مزدور ہیں چیتھڑوں میں مگن
منہ کا سینہ ہموار کرنے لگے
چھپاتے ہوئے ہڈیوں کے چلن
اس مشقّت کی کچھ قدر و قیمت نہیں
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن

گاؤں سے چرنے جنگل کی جانب چلے
ناتواں اہلِ ہمّت کسانوں کے دھن
جن کی اُٹھتی جوانی ہے پہنے ہوئے
دل بڑھاتی ہوئی محنتوں کے کفن

جانے کب سر سے پانی گزرنے لگے
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن آہ میرا وطن
خونِ دل صرف ہو یا پسینہ بہے !
کامیوں کو تو بس کام کی ہے لگن !
ہر زمیندار بانی سے ہے گھات میں
مصلحت سے سمیٹے ہوئے اپنا پھن
سائے گم ہو گئے دوپہر آ گئی ،
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن آہ میرا وطن
آدمیت سے کوسوں پرے جا چکی
صنعتی اہلِ سرمایہ کی انجمن !
سب مقاصد کے سائے میں چپ چاپ ہیں
اہلِ جرأت نے کھو دی ہے تابِ سخن
چیختے چیختے میں تو تھک بھی گیا
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن آہ میرا وطن
جانے کس روز بیدار ہو گی زمیں
جانے کب منہ سے بولیں گے دار و رسن

اس فضا سے تو بے حد پریشان ہیں
اہلِ ادراک، اہلِ نظر، اہلِ فن،
کاش اک انقلاب اور برپا کرے
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن
میں تو احسان دانش ہوں اک عمر سے
چلتے پھرتے جنازوں میں گرمِ سخن
اور ہر زندہ مردے سے کہتا ہوں یہ
چھین کر پیٹ بھر لے بھکاری نہ بن
جانشین آج یزداں کا ہے اہرمن
سو رہا ہے مگر آہ میرا وطن، آہ میرا وطن

نوجوانوں کی طرف سے

نئے اراکینِ حکومت کے نام

مُداوائے دردِ نہاں کر چکے ہیں
فُغاں کو سحر کی اذاں کر چکے ہیں!

جو غم قبرِ ماضی میں زندہ تھا اب تک
اُسے عشرتِ جاوداں کر چکے ہیں

لہو، آگ، دار و رسن، قید خانہ!
مکمّل یہ سب سُرخیاں کر چکے ہیں

کتابِ وفا میں شروعِ وفا سے
جو عنوان تھے داستاں کر چکے ہیں

زمانہ بڑے شوق سے سر اٹھائے
زمانے کا ہم امتحاں کر چکے ہیں

لہو میں جو چنگاریاں بجھ چکی تھیں
انہیں شعلۂ بے اماں کر چکے ہیں

تھے جس راہ میں راہزن ہر قدم پر
اسے جادۂ کہکشاں کر چکے ہیں

قدم جس کے چومے بہر گام منزل
مُرتّب وہ اک کارواں کر چکے ہیں

خزاں کو پکارو تو پلٹے گی ورنہ
بہاروں کو ہم جاوداں کر چکے ہیں

ہمیں خود بدلنے دو ماحول اپنا
بہت گردشیں آسماں کر چکے ہیں

جہاں رات صدیوں سے چھائی ہوئی تھی — وہاں صبح کو جاوداں کر چکے ہیں!
غرض برق ٹوٹے کہ صیّاد بگڑے! — جو تھی مرضیِ باغباں کر چکے ہیں
نئے چاند تاروں کو آواز دینا — زمینوں کو ہم آسماں کر چکے ہیں
نہ جانے مقام اُن کا گلشن میں کیا ہو — جو صرفِ بہارِ آشیاں کر چکے ہیں
جواب یہ کہیں گے وہ کرنا پڑے گا — جو تم نے کہا نوجواں کر چکے ہیں
حسابِ "دلِ دوستاں" توبہ توبہ — حسابِ دلِ دوستاں کر چکے ہیں

جو ہونا ہے دانشؔ وہ ہو کے رہیگا
جو کرنا تھا اے مہرباں! کر چکے ہیں

اشارات

نظر فریبِ فضا کھا گئی تو کیا ہوگا
حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
بزعمِ ہوشِ تجلّی کی جستجو بے سُود!
جنوں کی زد پہ خرد آ گئی تو کیا ہوگا
نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
نہ رہنماؤں کے حلقوں میں لے چلو مجھکو
میں بے ادب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہوگا
غمِ حیات سے بیشک ہے خودکُشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا

شبابِ لالہ و گل کو پکارنے والو!
خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہوگا
خوشی چھنی ہے تو غم کا بھی اعتماد نہ کر
جو روح غم سے بھی اُکتا گئی تو کیا ہوگا
یہ فکر کر کہ اس آسودگی کے دھوکے میں
تری خودی کو بھی موت آ گئی تو کیا ہوگا
جوان خون نئے کھیت کو مفید سہی
زمین فصل کو خود کھا گئی تو کیا ہوگا؟
وہ داستاں جو مصائب میں دفن ہے اب تک
زبانِ خلق پہ جب آ گئی تو کیا ہوگا
لرز رہے ہیں جگر جن سے کوہساروں کے
اگر وہ لہر یہاں آ گئی تو کیا ہوگا!
وہ موت جس کے ہیں احسان ہر طرف آثار
رموزِ زیست بھی سمجھا گئی تو کیا ہوگا

فروخت

عشق نے حُسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا
مصلحت کرتی رہی لاکھ جتن بیچ دیا

نام دے کر جسے مذہب کا رکھا تھا محفوظ
زر پرستوں نے وہ منشورِ کہن بیچ دیا

کوئی دیوانوں سے پوچھو یہ خموشی کیسی!
کیا کہیں نعرۂ تبخانہ شکن بیچ دیا

تم نے ابلیس سے مانگے ہیں مہ و خور کے گہن
تم نے خود کوکبِ تقدیرِ وطن بیچ دیا

جورِ صیاد کی کس منہ سے شکایت کیجے
اس چمن نے بھی تو ہر وصفِ چمن بیچ دیا

عشق نے حسن کی اک نیم نگاہی کے عوض
تاج و اورنگِ سلاطینِ زمن بیچ دیا

صرف نغمے ہی نہیں لَے بھی بدلنی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا

اُن تک آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی گرفت
جن دھندلکوں نے ستاروں کا کفن بیچ دیا

آجکل بارگہِ حسن ہے اور اہلِ ہوس
عشق نے سلسلہ دار و رسن بیچ دیا

لاکھ پامال و زبوں حال سہی ہم لیکن
یہ تو الزام نہیں ہے کہ وطن بیچ دیا

اب قفس ہی میں رہیں نغمہ سرایانِ بہار
پاسبانوں نے بگولوں کو چمن بیچ دیا

تشنگی اور تمازت کا سہارا لے کر
غازۂ رنگِ رُخِ سرو و سمن بیچ دیا

دِل اُمڈ آیا ہے بھر آئے ہیں آنسو دانشؔ
جب سُنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا،

اذانِ حیات

سحر قریب ہے شب کا سماں بدل ڈالو!
ہے اب حرام یہ خوابِ گراں بدل ڈالو
اُچٹ رہی ہے ستاروں کی نیند سُن سُن کر
یہ قصّہ ختم کرو داستاں بدل ڈالو
یہ سب شرارتِ گلچیں کے شاخسانے ہیں
چمن جلے نہ جلے آشیاں بدل ڈالو
نئے سجودِ محبّت کا یہ تقاضا ہے!
دعائے پست و غلط آستاں بدل ڈالو
جگا جگا کے تمہیں تھک چکے ہیں ہنگامے
خموش کیوں ہو یہ خوابِ گراں بدل ڈالو
کبھی ہُوا ہے نہ ہو گا شقاوتوں کو ثبات
یہ گُشت وخُوں یہ صلیب و سناں بدل ڈالو

تمھارے سامنے ماضی کے کارنامے ہیں
قدم بڑھاؤ رُخِ کارواں بدل ڈالو
اک انقلاب ہے ہر انقلاب کے ہمراہ
جہاں پُکار رہا ہے جہاں بدل ڈالو
بہر مقام جہانِ نوی کے ہیں آثار!
یہ ناصواب نظامِ جہاں بدل ڈالو
برس رہا ہے شگوفوں پہ آسماں سے لہُو
یہ نادُرست اُصُولِ خزاں بدل ڈالو!
زمانہ تیز قدم ہے فلک زبوں رفتار
زمیں عبور کرو، آسماں بدل ڈالو
غلط روی سے منازل کا بُعد بڑھتا ہے
مسافرو روشِ کارواں بدل ڈالو!
سفینہ جا کے کنارے پہ لگ تو سکتا ہے
ہوا کے رخ پہ چلو، بادباں بدل ڈالو
ہیں اس مقام کے حقدار رازدانِ چمن
جو پھول ہنس نہ سکیں باغباں بدل ڈالو

کیا چاہتے ہو

دوستو شاعرِ نادار سے کیا چاہتے ہو
رنگ و نکہت کے گرفتار سے کیا چاہتے ہو

ہے مری وقت کے خاموش تقاضوں پہ نظر
اس سے بڑھ کر مرے اشعار سے کیا چاہتے ہو

کیا یہ کچھ کم ہے کہ ہوتی ہے مساجد میں اذاں
اور اس دورِ زبوں کار سے کیا چاہتے ہو

حسن کے شوخ فسانے مرے امکاں میں نہیں
آدمیّت کے عزادار سے کیا چاہتے ہو

شکر کی جا ہے کہ ناموسِ حرم ہے محفوظ
اور گرتی ہوئی دیوار سے کیا چاہتے ہو

یہ غنیمت ہے سسکتے ہیں ابھی چند چراغ
بند ہوتے ہوئے بازار سے کیا چاہتے ہو

طالبانِ گُل و لالہ یہ کبھی سوچا ہے
کارگاہِ رَسن و دار سے کیا چاہتے ہو
راستے گُم ہیں، جرس گُنگ ہے منزل روپوش
اور اب قافلہ سالار سے کیا چاہتے ہو
میرے اِفلاس نے کھائی نہیں دولت سے شکست
اور اِس ملک کے فنکار سے کیا چاہتے ہو

شہرِ غزل

○

اب کہو کارواں کدھر کو چلے ! راستے کھو گئے، چراغ جلے
دن ہمارے نہ آسکیں گے بھلے ہم کہاں اُس کے آسماں کے تلے
آشیانوں میں ظلمتیں برسیں برق کے جس قدر چراغ جلے
آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں! رُوٹھ کر جب وہ آ لگے ہیں گلے
مائلِ انحطاط ہے ہر شے وقت کے ساتھ جیسے دھوپ ڈھلے
کاروانوں میں شورِ منزل تھا آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے!
عشق نے جن کو کر دیا آباد ان دیاروں میں پھر دیئے نہ جلے
ہم پہ گذری ہیں ہجر کی راتیں ہم جہنّم میں تھے، مگر نہ جلے
عشقِ غم کو عبور کر نہ سکا راستے کارواں کے ساتھ چلے
تھے محبت کی ابتدا کے قصور وہ تبسّم جو آنسوؤں میں ڈھلے
اُن کے بخشے ہوئے غموں کو نہ پوچھ دُور جیسے چتا میں آگ جلے
وقت کی قدر میکدے والو! رات ڈھلنے کو ہے، شراب ڈھلے!

نغمہ ہائے حیات گائے کون
ساز اترے ہوئے ہیں، خشک گلے

خاک سے سینکڑوں اُگے خورشید
ہے اندھیرا مگر چراغ تلے!

چاند ساکت ہے رک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

اختلافاتِ عافیت دُشمن!
دوستوں کی نوازشوں سے پلے!

میکدے کا تو ذکر بھی ہے گناہ
اب حیاتِ حرم پڑی ہے گلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

صبحِ نو کے گجر کو کیا معلوم
گھٹ گئے کتنے زمزموں کے گلے

ہم ہیں اُس خاکِ پاک سے وآنسؔ
جس کے ذرّوں سے آفتاب ڈھلے

بُرا ہو اس محبّت کا کہاں تک بات جا پہنچی
شکستِ ضبط سے اشکِ رواں تک بات جا پہنچی
تمہارے حسن کی روداد سے آغاز تھا لیکن!
مری دیوانگی کی داستاں تک بات جا پہنچی
وہاں شعلوں سے اُلجھی کونپلیں، کانٹوں پہ گل ٹُوٹے
جہاں خُونِ ضمیرِ گلستاں تک بات جا پہنچی
محبّت میں مجھے مارا مری زود اعتباری نے
یہ میری سادگی تھی رازداں تک بات جا پہنچی
ہے سارا کارواں بے راہ کون اب اس کو سمجھائے
کہ تنظیمِ گروہِ رہزناں تک بات جا پہنچی
بصد طنز و حقارت مسکرائے ان کے دیوانے
کہیں جب وسعتِ کون و مکاں تک بات جا پہنچی
نشیمن خاک کا اک ڈھیر تھا لیکن سحر ہوتے
ہوا سنکی تو سارے گلستاں تک بات جا پہنچی
بھریں گے کیا نہ بجلی روح میں سجدے جبینوں کے
کہ توہینِ وقارِ آستاں تک بات جا پہنچی

تھا جھگڑا فصل کی تقسیم پر صیّاد و گلچیں میں
کہ تقسیمِ زمینِ گلستاں تک بات جا پہنچی

بھریں گے اس حیاتِ نامرادی کو تو ہم لیکن
اگر مر کے حیاتِ جاوداں تک بات جا پہنچی؟

نہ کیوں کر ہر بلندی کی جبیں پر فکرِ پستی ہو
کہ اب ہر دل میں احساسِ زیاں تک بات جا پہنچی

نہیں میرے نشیمن تک ہی منصوبے تباہی کے
چمن والو! زوالِ گلستاں تک بات جا پہنچی

نہیں انساں سے ممکن عظمتِ انساں کا اندازہ
زمیں پر تبصرہ تھا آسماں تک بات جا پہنچی

خداوندا خدا میں دین و دنیا سونپ دیں کس کو
کہو کیا فیصلہ ٹھہرا؟ کہاں تک بات جا پہنچی

کہاں منزل نصیب اس کاروانِ تیرہ باطن کو
"جہاں قتلِ امیرِ کاروان تک بات جا پہنچی"

عمل میرے مجھے احساں کیا جنّت میں لے جاتے
بھلے کو اُس شفیعِ عاصیاں تک بات جا پہنچی

○

آپ کے جلوے جہاں تقسیم ہو کر رہ گئے
لاکھ خوابِ زرفشاں تقسیم ہو کر رہ گئے

اے فلک کب سے مسلّط ہے مرے گلشن پہ رات
صبح کے جلوے کہاں تقسیم ہو کر رہ گئے

کچھ مزاروں میں ہیں، کچھ زنداں میں، کچھ زیرِ عتاب
زندگی کے ترجماں تقسیم ہو کر رہ گئے

گردِ رہ ہر موڑ پر پہلے سے کم ہوتی گئی
آتے آتے کارواں تقسیم ہو کر رہ گئے!

جن سے مُشتق ہے جنوں جن سے برستی ہے شراب
جانے وہ بادل کہاں تقسیم ہو کر رہ گئے

ڈھل گئے تاراجیوں میں باغبانی کے مفاد
پہلے ہم، پھر آشیاں تقسیم ہو کر رہ گئے!

سارے آئینِ تجلّی، سارے دستورِ نیاز
اُن کے میرے درمیاں تقسیم ہو کر رہ گئے

اس سے بڑھ کر ہم گنہگاروں پہ کیا ہوگا عتاب!
اے خداوندِ جہاں! تقسیم ہو کر رہ گئے

انقلابِ گلستاں سے گلستاں کو کیا مِلا!
کچھ قفس، کچھ آشیاں تقسیم ہو کر رہ گئے

نالہ بلبل کو مِلا شبنم کو آنسو، گل کو رنگ!
ہم بجزِ گلستاں تقسیم ہو کر رہ گئے!

خود ہی آ اترے قفس پر بادِلِ ناخواستہ
جب یہ دیکھا آشیاں تقسیم ہو کر رہ گئے

نوجوانو! اپنے گرد و پیش پر رکھّو نگاہ!
تم وہیں ہو، ہم جہاں تقسیم ہو کر رہ گئے!

حسنِ بے تقصیر ملتا ہے، نہ عشقِ بے گناہ!
آہ دانش ہم کہاں تقسیم ہو کر رہ گئے

○

ذرّہ بہ ذرّہ ہے نہاں رازِ حقیقتِ چمن!
نکہتِ گُل سے کام رکھ، چھیڑ نہ گل کا پیرہن
چُپ ہیں ابھی تو لالہ و سُنبل و سوسن و سمَن
سعیٔ فضول و جذبِ خام! چاک ابھی سے پیرہن؟
جرأت آدمی ہے آج اُس رہِ نو پہ گامزن
بامِ فلک دُھواں دُھواں، فرشِ زمیں شکن شکن
رازیہ کب سمجھ سکے دشت نورد و کوچہ گرد
پوچھ وطن پرست سے عظمت و قیمتِ وطن
طرزِ حیات و عصرِ نو بے غم و فکر کر قبول
چرخ نیا، نئی زمیں، لوگ نئے، نیا چلن!
وقت کے فاصلے کے ساتھ جانے کدھر نکل گیا!
عشق کا خاص ولولہ، حُسن کا خاص بانکپن

اب یہاں کاروبارِ دل کون چلائے کیا چلے
ہو گئی جب زمانہ ساز شیشہ گردں کی انجمن

صحبتِ رفتگاں کی یاد، دردِ حیات بن گئی
حُسن ہے آج بے ردا، عشق ہے آج بے کفن

قیمتِ عشوہ و ادا اہلِ نظر کی بات ہے،
عظمتِ گل کہیں کہیں، شہرتِ گل چمن چمن

دانشِ بے نوا نہیں ان سے تجھے بھی کچھ گلہ !!
دیکھ ہے کس عروج پر حسن کی دوستی کا فن

○

نِکلوں جو یہاں سے تو بھلا جاؤں کہاں اَور
اِس شہر کے لوگوں کا ہے دل اَور زباں اَور
ہے میرے سوا بھی کوئی بیزارِ جہاں اَور
آئی ہے کہیں اَور سے آوازِ فغاں اَور
اشکوں کی جدا آب ہے پھولوں کا جُدا رنگ
کیا خوب تجلّی ہے یہاں اور وہاں اَور
مشکل سے نِکلتی ہے نظر اوڑھ کے آنسو
مِلتی ہے کہاں رخصتِ فریاد و فغاں اَور
ہم اِس کے ہوئے ہیں تو اِسی در کے رہینگے
ہوتا ہے تو ہونے دو دل و جاں کا زیاں اَور
جھنکار سے خوابوں میں شگافوں کے نشاں ہیں
کھلواؤ یہاں کارگہِ شیشہ گراں اَور!

کہرام ہے کہرام مگر کون سُنے گا ؟
گلچیں کی زباں اَور ہے گلشن کی زباں اَور

عقبےٰ ہے معاون مرے دنیا کے سفر میں
یہ بوجھ اتاروں تو گزرتا ہے گراں اَور

جز خلوت و لب بستگی و ضبط و تحیّر
کیا بات کریں اپنے مکینوں سے مکاں اَور

روداد ہے اتنی سی خلاؤں کے سفر کی
ہے پردۂ انساں میں کوئی ذاتِ نہاں اَور

ہنس کر نہ کرو بات مہذّب نہیں ماحَول
بے رحم زمانے کو گزرتا ہے گماں اَور

خوش کن تو سہی ترک محبّت کا تصور
یہ آگ جو بجھتی ہے تو دیتی ہے دھواں اَور

کوَن اس کو سمجھتا ہے کہ تنہائی کا احساس
جب چاند نکلتا ہے گزرتا ہے گراں اَور

حق بات پہ دانش وہ بگڑتے ہیں تو بگڑیں
اک وہ بھی سہی سینکڑوں دشمن ہیں جہاں اَور

○

پاسِ ادب ہے اس لیے ہم بولتے نہیں
جب بولتے ہیں، آپ سے کم بولتے نہیں!

اس خاکدانِ دہر کا کچھ ماحصل بھی ہے
کیوں رہروانِ راہِ عدم بولتے نہیں!

ہیں جس قدر بھی آپ کے شائستۂ نظر!
کھا کھا کے دل پہ ناوکِ غم بولتے نہیں

آواز دے رہا ہے یہ آذر کدہ سے کون!
ہم نے تو یہ سُنا تھا صنم بولتے نہیں

انسان چاہتا ہے مُداوائے اضطراب
اے ساکنانِ دیر و حرم بولتے نہیں؟

حائل ہے ہم میں ان میں اک ادنیٰ سا اختلاف
مدت گزر گئی ہے بہم بولتے نہیں

بڑھ بڑھ کے بولتے ہیں کبھی تھے جو کم سواد
جو کھو چکے غریب بھرم، بولتے نہیں

اللہ رے وہ ان کی ندامت جفا کے بعد
گردن ہے اعتراف میں خم، بولتے نہیں

گزرے ہیں ایسے لوگ بہت کم نگاہ سے!
چہروں پہ جن کے رنج و الم، بولتے نہیں

دنیا سمجھ رہی ہے اُنہیں ہم سے مُنسلک!
جن کے معاملات میں ہم بولتے نہیں

منزل نہ لے سکیں گے کبھی ان کے کارواں
جن رہبروں کے نقشِ قدم بولتے نہیں

ہم کو ہمارے منہ پہ وہ کہتے ہیں بیوفا
احساںؔ ہم خدا کی قسم بولتے نہیں

○

دل اب بہ حسنِ شام و سحر مطمئن نہیں
اِن تنگ وسعتوں میں نظر مطمئن نہیں

سُن تو لیا غلط ہے غلط ، یہ چمن گری
میں خود بایں مقامِ نظر مطمئن نہیں

تیرا کرم کرم ہے مگر اس کا کیا علاج !
ہم نامُراد ، خاک بسر مطمئن نہیں

پیغامِ زندگی ہے رہِ آرزو میں موت
کیوں مطمئن نہیں ہے اگر مطمئن نہیں

دنیا حسیں، زمیں حسیں، آسماں حسیں
لیکن مرا مذاقِ نظر مطمئن نہیں

اختر شناسِ وقت مگر اس سے بیخبر
شب مطمئن نہیں کہ سحر مطمئن نہیں

ہو گا ضرور رنگ و نوا سے ورا بھی حُسن
میری نگاہِ نقش نگر مطمئن نہیں!

الفاظ میں ڈھلے نہ ڈھلے کاروانِ غم
کچھ صاحبانِ راہگزر مطمئن نہیں

ہیں بے کمال و بے ہُنر اس دَور میں بلند
اہلِ کمال و اہلِ ہنر مطمئن نہیں

کہدے یہ کوئی خضر سے جا کر بہ احترام
اس رہبری سے اہلِ سفر مطمئن نہیں

اعلان کر رہا ہے کچھ ایسا نقیبِ وقت!
خاموش سب ہیں کوئی مگر مطمئن نہیں

روزِ ازل سے رُو بہ ترقی ہے کائنات
لیکن ہنوز نوعِ بشر مطمئن نہیں

احسان ساکنانِ حرم ہوں کہ اہلِ دَیر
کوئی بھی تا بہ حدِّ نظر مطمئن نہیں

○

دیدہ و دل کو ہراساں نہیں دیکھا جاتا
اپنا گھر کچھ بھی ہو ویراں نہیں دیکھا جاتا
عشق خودداری و غیرت کو کہاں تک کچلے
حسن جب اپنا نگہباں نہیں دیکھا جاتا
ایک ہی درد سے بیتاب ہیں ہم ہوں کہ حریف
تیرا غم اس قدر ارزاں نہیں دیکھا جاتا
ہر گنہگار کا حصّہ نہیں رحمت کی نگاہ
ہر گنہگار پریشاں نہیں دیکھا جاتا!
اشک جو حُسن کی تخلیق میں ہوتے ہیں شمار
اُن کو آلودۂ مژگاں نہیں دیکھا جاتا
اپنی رسوائی قبول اپنی تباہی منظور
ان کو محجوب و پریشاں نہیں دیکھا جاتا
کوئی تو گونج ہو نغمہ نہیں ماتم ہی سہی
دم بخود صحنِ گلستاں نہیں دیکھا جاتا!

خاک سے لالۂ گل کیوں نہیں اگتے یارب
رائگاں خونِ شہیداں نہیں دیکھا جاتا

حسن اب شعر، نہ نغمہ نہ تبسّم، نہ شراب
یہ سِتم اے غمِ دوراں نہیں دیکھا جاتا

رنگ غنچوں کو میسّر ہے نہ پھولوں کو شمیم
اب یہ افلاسِ بہاراں نہیں دیکھا جاتا

حشر میں جلوۂ یزداں سے نہ جانے کیا ہو
ہم سے تو جلوۂ انساں نہیں دیکھا جاتا

جس میں سبزے کی رعایت ہو نہ سُنبل کا لحاظ
ایسا دستورِ بہاراں نہیں دیکھا جاتا

جامہ چاکی میں رکیں ہاتھ تو ناقص ہے جنوں
اس میں دامان و گریباں نہیں دیکھا جاتا

جو رہے میری پریشانیٔ خاطر کا سبب
ان کو اب مجھ سے پریشاں نہیں دیکھا جاتا

کثرتِ خار سے حیراں ہیں رہیں مسدُود
پھُول کوئی کہیں خنداں نہیں دیکھا جاتا

○

کب سے خزاں ہے کوئی خبر لے بہار کی
حد ہو چکی ہے، تاب نہیں انتظار کی!

اٹھے ہیں پردہ ہائے تکلّف بہ احتیاط
رہ رہ کے مسکرائی ہیں راتیں بہار کی،

اک زمزمہ بہار ہے، اک اشکِ غم خزاں
ہر فصلِ گلستاں ہے ترے اختیار کی

اب ہم خزاں پرست حریفِ نشاط ہیں!
ہم نے چمن سے قید اٹھا دی بہار کی!

مَیں رُوحِ روزگار کا جوہر شناس ہُوں!
تم بات کر رہے ہو غمِ روزگار کی!

بیدرد باغباں ہے، گل و لالہ خود غرض
کِس کو خبر تھی یہ ہے حقیقت بہار کی

ممکن ہے اب ہو نظمِ چمن میں خزاں کا ہاتھ
پھُولوں سے سُن رہا ہوں شکایت بہار کی

راہِ وفا میں جبرِ مشیّت کے باوجود
میری تباہیاں تھیں مرے اختیار کی

اہلِ قفس اگر نہ پہنچتے تو باغباں!
دنیا بدل چکی تھی ترے لالہ زار کی

جس طرح بن پڑی ترے غم سے کیا نباہ
آنسو نہ جب رہے تو ہنسی اختیار کی!

میری طلب بھی سوءِ ادب میں نہ ہو شمار
اک لازوال پر ہے نظر مستعار کی!

تاراج کر رہے ہیں چمن کو نوا فروش
در پردہ ہو رہی ہے تجارت بہار کی!

ہنستے ہیں پھول گریۂ شبنم کے ساتھ ساتھ
خامی نہ پوچھ تربیتِ لالہ زار کی

آندھی میں کب جلے ہیں چراغِ نشاط و رنگ
جوشِ بہار خود ہے تباہی بہار کی!

احساںؔ پھر لگے گا کوئی زخمِ دل فروز
پھر اس نے دوستی کی روِش اختیار کی

○

ہزار بار جلا گرچہ آشیاں اپنا!
نہ کچھ بگاڑ سکی برقِ بے اماں اپنا!
جہادِ شوق نہ جائے گا رائیگاں اپنا
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کارواں اپنا
کوئی تو بات ہے آخر کہ ساکنانِ چمن
اُجاڑنے پہ تلے ہیں خود آشیاں اپنا!
اسی طرح ہے اگر ارتقا کی خوش گامی
ترا جہاں بھی یہ ہو گا کبھی جہاں اپنا
نہ جانے کتنے ستم توڑتے جہاں والے
زہے کرم کہ ترا غم ہے پاسباں اپنا
مجاہدانِ وفا زادِ راہ کیوں لیتے!
کفن بنے گی یہی گردِ کارواں اپنا

مَیں ان کا ذکر بھی کرتا ہوں احتیاط کے ساتھ
ہے جن سے رازِ محبّت ابھی نہاں اپنا

مجھے تو سارے چمن کی ہے عافیت مطلوب
نہیں یہ فکر کہ جلتا ہے آشیاں اپنا

نہ احترامِ بہاراں، نہ سدِّ بابِ خزاں
فضا شناس نہیں آہ باغباں اپنا

دعائے مرگ مریضانِ عشق کیوں مانگیں
یہ مرحلہ ہے بمقدارِ یک فغاں اپنا!

خوشی وطن میں ملی تھی نہ راس ہے، غربت
بہت اُچاٹ ہے دل مرگِ ناگہاں! اپنا

ہمیں تباہیٔ سرو و سمن نہیں مقصود
چمن میں ہم نہ بنائیں گے آشیاں اپنا

وفا کی آگ تو دونوں طرف بھڑکتی ہے
جو اُس طرف ہے وہی حال ہے یہاں اپنا

کبھی جنوں نے اصولِ سفر پہ بات نہ کی!
گزر گیا یونہی منزل سے کارواں اپنا

دلوں کی ہُوک کو اس وقت کارگر جانو
جو بتکدوں میں بھی چھوڑے اثر اذاں اپنا

مجھے قبُول نہیں مرگِ ناگہاں ایسی
تم اپنے پاس رکھو لطفِ ناگہاں اپنا

تمھیں بتاؤ کچھ اے زندگی کے ویرانو
کہ ہم کہاں ہیں، کِدھر گم ہے کارواں اپنا

یہاں سے اٹھ کے کہاں جائیں کس لئے جائیں
یہ آستاں ہے اب اے جانِ آستاں اپنا

پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ خانقاہیں ہیں
جنوں میں نقشِ قدم تھا جہاں جہاں اپنا

یہ گلستاں کہ جہاں خار و گل ہیں سب محفوظ
یہیں اماں کو ترستا ہے آشیاں اپنا

سنا رہا ہے کہیں سے کوئی کہیں سے کوئی
حیات ایک فسانہ ہے خُونچکاں اپنا

زمانہ کیوں مری پامالیوں میں کوشاں ہے
دل آج تک تو نہیں اتنا شادماں اپنا

وہ دوستی سے چلے دشمنی تک آ پہنچے!

وفا میں حاصلِ ہستی ہے رائگاں اپنا

بیک صدا جو پُکارا کیے بہاراں کو
قفس سے ہو گیا نزدیک آشیاں اپنا

نہ جانے خاک اڑے گی کہ پھول برسیں گے
تغیّرات کی زد پر ہے گلستاں اپنا!

یہاں بہاؤ نہ آنسو یہاں اڑاؤ نہ خاک
کہ ہر مزار ہے خاموش نوحہ خواں اپنا

ہمیں ہیں وہ کہ جو صیّاد سے نہیں بچتے
ہمیں قفس کو سمجھتے ہیں آشیاں اپنا

کبھی وہ صرف مجھی تک تھے آہ اے دانشؔ
گئی وہ بات، زمانہ وہ اب کہاں اپنا!

○

ہے کون، کہیں جس کی ملاقات نہیں ہے
تم جس کو چھپاتے ہو یہ کچھ بات نہیں ہے
کس کس کی زباں روکنے جاؤں تری خاطر
کس کس کی تباہی میں ترا ہات نہیں ہے
اے عشق بساطِ طلب و ترک سے ہوشیار
جس رخ پہ وہ بیٹھے ہیں وہاں مات نہیں ہے
کی تم نے کہیں میری برائی تو ہوا کیا!
یہ بات محبت میں کوئی بات نہیں ہے
ڈرتا ہوں کہ ہم تم میں نہ حائل ہو زمانہ
ہر چند کہ یہ صورتِ حالات نہیں ہے
جب چاہا تصور میں اُنہیں کر لیا سجدہ
اس زہد میں پابندیِ اوقات نہیں ہے!

شبہات ہی شبہات ہے دنیائے محبت
یہ بات نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ہے!

ہیں شیخ و برہمن حرم و دَیر سے بیزار
رندوں میں یہ توہینِ روایات نہیں ہے!

اب ان کے تصور میں گذرتے ہیں شب و روز
جن سے کوئی امیدِ ملاقات نہیں ہے

ممنون ہوں کیونکر نہ تری چشمِ کرم کا!
اب ہوں میں جہاں یہ مری اوقات نہیں ہے

میخانے میں رندوں کے لہو سے ہے اُجالا
یہ جلوۂ ساقی کی کرامات نہیں ہے!

کان آکے بھرے ہیں مری جانب سے کسی نے
ماتھے پہ شکن آپ کے بے بات نہیں ہے

ساون میں برستا ہو جہاں زہر ہلاہل
وہ میرا چمن وہ مری برسات نہیں ہے

احساں کو نزدیک سے دیکھو تو یقیں ہو
نادار تو ہے بندۂ حاجات نہیں ہے

○

کوئی بتاؤ ٹھکانا ہے اب کہاں اپنا
شکارِ فتنۂ منزل ہے کارواں اپنا

سفر ہو اَور نہ جانے کہاں کہاں اپنا
نہیں ہے صرف یہی ایک خاکداں اپنا

یہاں تو سجدۂ غم بھی ہے رائگاں اپنا
مَیں اُٹھ رہا ہوں سنبھالو تُم آستاں اپنا

گزر گئی مہ و انجم سے بھی نظر اپنی
بلند ہے مہ و انجُم سے بھی جہاں اپنا

حُضُورِ حسن سوال و جواب کیا معنی؟
کِسی کو ہوش ہی رہتا نہیں جہاں اپنا

سفیرِ عرش پہ نقدِ سُخن ہَے بے اَدبی
وُجود کیا ہے بجُز گردِ کارواں اپنا

بڑھائیں مشقِ تصوّر تو چار ہی دن میں
قفس سے صاف نظر آئے آشیاں اپنا

خیال کر کہ جو آسودہ ہو تو کیا شے ہو
پنپ رہا ہے جو کانٹوں میں آشیاں اپنا

اس التفات کے قرباں کہ تیری محفل میں
سمجھ رہے ہیں سبھی مجھ کو رازداں اپنا

شکستِ ضبط اصولِ وفا نہیں ہر چند
سکونِ مرگ ہے انجامِ یک فغاں اپنا

حرم میں، دَیر میں، تاروں میں، مرغزاروں میں
جو تم ہی تم ہو ٹھکانا ہے پھر کہاں اپنا

جو اہلِ ذوق ہیں پوچھ اُن سے عظمتِ طوفاں
کنارہ خواہ نہیں ذوقِ بیکراں اپنا!

دیا نہ ساتھ کسی رہنما نے منزل تک
خود اپنے بل پہ رَوا رَو ہے کارواں اپنا!

ہیں ناتمام ابھی بے شمار ہنگامے
ابھی وِقار گنوائیں نہ نوجواں اپنا

جہادِ زیست جرس سے نہیں اصُول سے ہے
مگر اصول سے غافِل ہے کارواں اپنا

یہ باغباں تو نہیں فصلِ گل کے تاجر ہیں
خود انتظام کرے بزمِ گلستاں اپنا

سُنا رہے ہیں کسی کو سمجھ رہا ہے کوئی
جدا ہے سب سے اک اندازِ داستاں اپنا

گلوں سے پوچھ کے کانٹے چُنے نہیں جاتے
وقار کھوئیں نہ اربابِ گلستاں اپنا

وہ افتخار کہ قُدسی لحاظ پر مجبُور
یہ انحطاط کہ مسکن ہے خاک داں اپنا

بڑے ہی ظرف کی شے ہے کسی کا پردۂ عشق
سنا ہے ہوگیا دیوانہ رازداں اپنا

یہ رات نیند نہیں، موت دیکھے جائے گی
جو تم بدل نہ سکے رنگِ داستاں اپنا

غیور ہے تری پستی تو رفعتیں لاکھوں
زمین ہے تو بنے گا خود آسماں اپنا

متاعِ روح یونہی تابناک رہتی ہے
کہ جسمِ موت سے پہلے ہو رائگاں اپنا!
ہُوا فریبِ محبّت میں جب کوئی برباد
خیال آیا ہے احسان ناگہاں اپنا

○

مفت بازارِ محبّت میں تماشا نہ بنے
جس کو بننا ہو سمجھ سوچ کے دیوانہ بنے

شمع، ظاہر ہے کہ شعلے کے سوا کچھ بھی نہیں
کر سکے خاک جو خود کو وہی پروانہ بنے

حائل اب تک بھی محبت میں چلے آتے ہیں
چند وہ غم جو کبھی میری تمنّا نہ بنے

حرم و دَیر کی راہوں میں تو مٹّی ہے خراب
وہ مزے میں ہیں جو خاکِ درِ جانانہ بنے

بزمِ دنیا میں غموں کا تو نہیں کال، مگر
ہے کوئی غم جو حریفِ غمِ جانانہ بنے

اس زمانے میں ہیں آئینِ محبّت کچھ اَور
اب کوئی حسن کے ہاتھوں میں تماشا نہ بنے!

ٹمٹماتے ہُوئے مٹّی کے دِئے پر نہ ہنسو
یہ بھڑک کر نہ کہیں شعلۂ کاشانہ بنے
کوئی خود بھی کہیں رُسوائی کو کرتا ہے قبول
تم نے دیوانہ بنایا ہے تو دیوانہ بنے!
عشق اک راز ہے اور راز بھی دل تک محدُود
حُسن کی سطح تک آجائے تو افسانہ بنے!
غمِ عقبیٰ کے تدارک میں ہر ایثار و عمل
غیر ممکن ہے علاجِ غمِ دُنیا نہ بنے!
وادیٔ نیل پہ برسا ہے لہُو بے موسم
مجھ کو ڈر ہے کہ یہ گلشن بھی نہ ویرانہ بنے
گرچہ اک نقشِ حقیقت ہوں میں لیکن دانشؔ
بعض احباب کی کوشش ہے کہ افسانہ بنے

○

آیا ہے حُسن حشر کا ساماں کیے ہُوئے
بُشرے پہ رنگِ عشق نمایاں کیے ہوئے
گلشن پرستِ کنجِ قفس میں ہیں مطمئن!
حدِ نظر کو حدِّ گلستاں کیے ہُوئے
ہاں ہم ہیں جن کو دَیر و حرم میں نہیں سکُوں
ہم ہیں طوافِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے
مصروف ہیں بہار فروشی میں باغباں
ہم عزمِ انقلابِ گلستاں کیے ہُوئے
اُن شیشہ خاطروں کی وفا پر نگاہ کر!
جن کو سکونِ دل ہے پریشاں کیے ہوئے
گو ہے مشاہدہ تو تصوّر کے برخلاف
دل ہے یقینِ عظمتِ انساں کیے ہُوئے

دنیا کھڑی ہے دیکھنے والوں کی منتظر!
ہر شئے کو اک نشاط کا عنواں کیے ہوئے

آئی تھی ہر روش پہ اُڑاتی ہوئی عبیر
گزری بہار چاک گریباں کیے ہوئے

زنداں کی مشکلات سے اکتائیں کس لیے
جو آ رہے ہیں گھر کو بیاباں کیے ہوئے

یہ کون ہنس کے صحنِ چمن سے گذر گیا
اتبک ہیں پھول چاک گریباں کیے ہوئے

کر اس کا احترام کہ فطرت ہے آج تک
سب سے بلند پرچمِ انساں کیے ہوئے

آتی ہے موت اس کے شہیدوں کے سامنے
زلفِ حیات رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

بھٹکے ہوئے دماغ ہیں بہکے ہوئے خیال!
انسانیت ہے بیعتِ شیطاں کیے ہوئے

شعلوں کو دے گیا کوئی ادراکِ گفتگو
موسیٰؑ کو لکنتوں سے ہراساں کیے ہوئے

تو ہو تو خیر کوئی شکایت نہ ہو، مگر
جلوے ہیں تیرے مجھ کو پریشاں کیے ہوئے

شادابیٔ بہار میسّر نہ آئے گی!
جنگل پہ اعتبارِ گلستاں کیے ہوئے

دل جاگتا ہوا ہے تو بڑھتی ہے ہر نگاہ
ذرّوں کو وسعتوں میں بیاباں کیے ہوئے

دیکھ ان کا ظرف جو سرِ گلشن جنوں پرست
بیٹھے ہیں ضبطِ چاکِ گریباں کیے ہوئے

کب سے غریب ہیں تری رحمت کے منتظر
آنکھوں میں آنسوؤں سے چراغاں کیے ہوئے

تو اپنے آئینوں کی تحیّر پہ رحم کر
مدّت ہوئی ہے جنبشِ مژگاں کیے ہوئے

احساں آئے ہیں وہ مرے گھر پہ بارہا
خاموشیٔ نظر کو غزلخواں کیے ہوئے

○

گزرا بھی سرِ منزل بھلا کہاں اپنا
نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں اپنا!

سنائیں جا کے کسے اب غمِ نہاں اپنا
ہے ان کا دوست، جو کل تک تھا رازداں اپنا

یہ چار دن کو قفس سے رہائی کیا معنی
بہار تک ہے گلستاں میں آشیاں اپنا

ترے خرابے سے باہر نہیں تری آواز
کبھی کیا بھی ہے اندازۂ اذاں اپنا؟

بجا کہ منزلیں مضطر ہیں رہروؤں کیلئے
شمار راہروؤں میں مگر کہاں اپنا

نمو کا دَور تو آئے، ہوا کا رخ تو پھرے
پتہ بتائے گی خود شاخِ آشیاں اپنا

کِسے تلاش کروں، کِس کو معتبر جانوں
تمہیں نہیں تو کہاں کوئی مہرباں اپنا

فسانہ ہائے جہاں کا ہے ایسا کچھ اسلوب
کہ جیسے اَور بھی کوئی ہے اک جہاں اپنا

لہو لہان ہیں شاخیں، دھواں دھواں ہے بہار
وَرق پلٹتی ہے تاریخ گلستاں اپنا

مری زمین، مرے آسماں، پکار مجھے
نہ یہ زمین ہے اپنی نہ آسماں اپنا

بھڑک کے آتشِ گل جا لگی ہے شاخوں میں
گھرا ہے اپنے ہی شعلوں میں آشیاں اپنا

ہے اپنی اپنی طلب میں مسافروں کا ہجوم
نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں اپنا

نہ جانے اَور ابھی کتنے انقلاب آئیں
بنے گا بنتے ہی بنتے نیا جہاں اپنا

قفس کے فیض سے وہ وسعتیں نصیب ہوئیں
نظر کے سامنے رہتا ہے آشیاں اپنا!

ہزار غم کو چھپاؤ ہزار اشک پیو
تمام حال زمانے پہ ہے عیاں اپنا

اصولِ راہ سے بالا ہے منزلِ مقصود
غبارِ بن کے چلے کاش کارواں اپنا

خزاں کے جَور کو تنکا بھی چھوڑنا ہے گناہ
اسی بہار میں پھونکیں گے آشیاں اپنا

جس انجمن میں لیے جا رہی ہے بیتابی
وہاں تو حال بھی ہوتا نہیں بیاں اپنا

جو رہروؤں میں یہی اختلافِ باہم ہے
پہنچ سکے گا نہ منزل پہ کارواں اپنا

بہار نے ہمیں بخشی ہے کون سی راحت
خزاں بھی آئے! بگاڑے گی کیا خزاں اپنا

شراب و نغمہ و شاہد سے ہم کہاں مانوس
کہ آہِ سرد ہے اسلوبِ داستاں اپنا

زباں پہ ان کا فسانہ ہے اور جنوں کے نثار
کسی پہ حال ابھی تک نہیں عیاں اپنا
کچھ ایسی اُن سے جدا ہو کے زندگی گزری
کہ جیسے حاصلِ ہستی ہے رائگاں اپنا
وہاں سے دادِ سخن کی امید کیا دانشؔ
جہاں نہ ہو کوئی انسان قدرداں اپنا

○

بت ہو کہ خدا میری نظر دونوں طرف ہے
شاعر کو رَدا سجدۂ در دونوں طرف ہے

وہ جلوہ تو کیا میرا جنوں بھی نہیں محفوظ
مشکوک زمانے کی نظر دونوں طرف ہے

بخشی ہے جو تقسیم نے اخلاق کی پستی!
وُہ پستیٔ معیارِ بشر دونوں طرف ہے

بینا ہو اگر دل تو یہیں سب دشت و چمن ایک
آنکھوں کے لیے پردۂ در دونوں طرف ہے

زہرہ کا ترانہ ہو کہ بلبُل کا ترنّمُ!
وہ نغمہ زن و نغمہ نگر دونوں طرف ہے

پستی ہو، بلندی ہو، کسی سمت نکل جا
بے منزل و بے راہ سفر دونوں طرف ہے

جھنجھلائے ہوئے سُرخ ستاروں کو سنبھالو
بگڑا ہوا اندازِ سحر دونوں طرف ہے!

وعدے کا تعیُّن ہو کہ دیدار کی تقریب
ہنگامہ گہِ قلب و نظر دونوں طرف ہے

ہے دیر و حرم ایک ہی منزل کا دوراہہ
رہرو ہوں تو امکانِ خضر دونوں طرف ہے

دنیا میں بھی عقبےٰ میں بھی اے رحمتِ عالم!
مخلوق تری دست نگر دونوں طرف ہے

نفرت بھی محبت کا ہے اک پہلوئے روشن
آنکھوں سے تو اوجھل ہے مگر دونوں طرف ہے

ہیں رہ کے نشیمن میں قفس سے نہیں غافل
صد شکر کہ پروازِ نظر دونوں طرف ہے

ہیں شعلہ و گُل ایک کوئی دیکھے نہ دیکھے
تنویر بہ مقدارِ نظر دونوں طرف ہے

آزاد ہوئے، دیر و حرم میں ہے چراغاں
اِنسان مگر خاک بسر دونوں طرف ہے!

باہر نہیں خطرے سے قفس ہو کہ گلستاں !
اک کشمکش برق و شرر دونوں طرف ہے
غمخانۂ احساں ہو یا وادیٔ سینا !
کوتاہیٔ دامانِ نظر دونوں طرف ہے

○

نظر بنتی ہے نغمہ، خوش دلِ ناشاد ہوتا ہے
سکوتِ مستقل جب حاصلِ فریاد ہوتا ہے

تعلق ہی نہ ہو تو پھر شکایت کا محل کیسا ؟
محبت کی بنا پر شکوۂ بیداد ہوتا ہے

چمن میں نکہت و گل، رازداں ہیں نکہت و گل کا
کہ خوشبو بے ثبات، اور رنگ بے بنیاد ہوتا ہے

شبوں کو ٹوٹنے لگتی ہیں کھنچ کھنچ کر رگیں دل کی
بہ جبرِ خاص انساں مجرمِ فریاد ہوتا ہے

جہادِ برہمن کو اس تصور سے سراہے جا
جہاں بتخانہ بنتا ہے، حرم آباد ہوتا ہے

اثر ماحول کا کچھ رنگ بھرتا ہو تو بھرتا ہو
بذاتِ خود شباب اک فتنۂ آزاد ہوتا ہے

جنوں اور خیر مخلص ؟ عاشقی اور مصلحت بینی ؟
کہیں دنیا میں یوں بھی اے ستم ایجاد ہوتا ہے

ہوس اچھی نہیں لطف رگی پر اکتفا کرے
جہاں ہنگامۂ گُل ہے وہیں صیاد ہوتا ہے !
خوشی آجاتی ہے بے قید ہو کر فردِ عصیاں میں
جنوں کا نام پاتا ہے جو غم آزاد ہوتا ہے
خدا رکھّے مرے دل کے خرابے کو خدا رکھّے
برستی ہے تباہی جس قدر آباد ہوتا ہے !
جنونِ عشق کے ہیں سب کرشمے ورنہ جلووں سے
خوشی تخلیق ہوتی ہے نہ غم ایجاد ہوتا ہے
خیاباں وار نغمے گلستاں والوں کو راس آئیں
مگر نو واردوں کے حق میں کیا ارشاد ہوتا ہے
فضا کو مست ہو جانے دو رنگِ گل نکھرنے دو
دکھا دیں گے نشیمن خود بخود برباد ہوتا ہے !
بلا دُنیا سے جو تقسیم کر دے اہلِ دُنیا کو
تو اپنے ساتھ کیا لایا تھا ؛ کیا برباد ہوتا ہے
محبت کر کے کیوں احسان شکوہ ہے تباہی کا
بمقدارِ طلب ہر آدمی برباد ہوتا ہے ،

○

تہذیب کے دربان کئی سال سے چُپ ہیں
ہنگامہ نہ اعلان کئی سال سے چُپ ہیں

زیبا نہیں بیدادِ زمانہ کی شکایت
ہم بھی تو مری جان کئی سال سے چُپ ہیں

اک عمر سے تعمیرِ چمن کی تھی تمنا
اب حسرت و ارمان کئی سال سے چُپ ہیں

نغمات پہ پہرہ ہے نہ فریاد پہ بندش !
پھر بھی چمنستان کئی سال سے چُپ ہیں

غربت بھی نہ راس آئی وطن چھوڑ کے جن کو
وہ صاحبِ ایمان کئی سال سے چُپ ہیں

رکتا ہے کہیں قافلۂ عظمتِ آدم
ہر چند حُدی خوان کئی سال سے چُپ ہیں

جن جن کو پریشانیٔ عالم کا قلق تھا !
اب ششدر و حیران کئی سال سے چُپ ہیں

چرچے تھے جہاں نغمۂ طاؤس کے ہر وقت
وہ گونجتے ایوان کئی سال سے چُپ ہیں

اب عشق ہے بے غیرت و بیباک و زبوں کار
جلووں کے نگہبان کئی سال سے چُپ ہیں

مُحتاط ! کج اندیش اراکینِ سیاست !
بپھرے ہوئے انسان کئی سال سے چُپ ہیں

بُتخانے کی تعمیر کے انداز نہ پوچھو!
کعبے کے نگہبان کئی سال سے چُپ ہیں

شعلے کبھی رہتے تھے رواں جن کے لہُو میں
وہ بے حس و بے جان کئی سال سے چُپ ہیں

حق بات پہ اس دَور میں کٹتی ہیں زبانیں
مجبور ہیں احسانؔ کئی سال سے چُپ ہیں!

○

یہ بھی درست خود پہ ہماری نظر نہیں
یہ بھی غلط نہیں، تمہیں اپنی خبر نہیں
اٹھتی ہیں سب کی گردشِ انجم پہ انگلیاں
اپنی سبک روی پہ کسی کی نظر نہیں
اب حسن میں بھی کم ہیں جنوں آفرینیاں
اب عشق بھی خراب سرِ رہگزر نہیں!
ظلمت نگل چکی ہے ستاروں کے آب و رنگ
اب یَں تو کیا کسی کو امیدِ سحر نہیں
میخانے کھل گئے ہیں کہ زنداں بھرے گئے
پہلا سا اب ہجوم سرِ رہگزر نہیں!
اٹھ اے وفا پرست مآلِ سفر نہ پوچھ
راہِ جنوں طویل سہی پُر خطر نہیں!

شکوہ نہ کر کہ پردے نظر سے نہیں اٹھے
پردے اُٹھے تو چیخ اٹھے گا، نظر نہیں

رستہ سُجھائی دے تو چلے کیوں نہ کارواں
تارے تو ہیں، نہ ہو جو نمودِ سحر نہیں

مشکل نہیں ہے چارۂ بیچارگیٔ عشق
ممکن تو ہے علاجِ محبت، مگر نہیں

میری نظر میں عشق ہے مجبوریوں کا نام
آخر کسے مآلِ وفا کی خبر نہیں

کہنے کو یوں تو خضر ہے ہر راہرو یہاں
منزل کی قافلے میں کسی کو خبر نہیں

مَیں اور دوست کہہ کے تقاضا کروں تلاش
احساں یہ مرا تو اصولِ نظر نہیں!

○

بطورِ خود کسی کا جب وہ مستقبل بدلتے ہیں
سکونِ دل سے رنجِ دُوریٔ منزل بدلتے ہیں
وفا سے دور ہیں جو دل لگا کر دل بدلتے ہیں
جنوں آگاہ کب یہ راہِ بے منزل بدلتے ہیں
تبسّم ہو کہ آنسو، حُسن والوں کا یہ شیوہ ہے
بہر انداز، اندازِ شکستِ دل بدلتے ہیں،
ہزار آواز دیں دنیا و عُقبیٰ کے حسیں منظر
کہیں اپنی ڈگر سودائیٔ منزل بدلتے ہیں
غمِ منزل؟ اگر تیری نظر میں حسنِ منزل ہو
ابھی دن تیرے اے زحمت کشِ منزل بدلتے ہیں
صدائے حُسن پر لبیک یہ اک جبرِ فطرت تھا
ہمارا دِل بدل دے، ہم تری محفل بدلتے ہیں

انہیں غفلت نے جانے کونسی دنیا میں جا پھینکا
ابھی کروٹ کہیں آسودۂ ساحل بدلتے ہیں

حقارت سے مرے ترکِ وطن کو دیکھنے والو!
پرندے تک نشیمن کو بصد مشکل بدلتے ہیں

بچو بازیگرانِ دورِ حاضر سے کہ یہ ظالم
نظر کے سامنے آئی ہوئی منزل بدلتے ہیں

اگر انسان ہے تعظیم کر خاکِ شہیداں کی
کہ یہ سر باز انسانوں کا مستقبل بدلتے ہیں

اگر ذوقِ تجسّس میں خلوصِ دل بھی شامل ہو
وہ اپنے ہاتھ سے خود پردۂ منزل بدلتے ہیں

حجابِ لالہ و گل سے نکل کر سامنے آؤ
کہیں پردے سے دستورِ نگاہ و دل بدلتے ہیں

لہو ممکن ہے لَو دینے لگے پھر نوجوانوں کا!
سکوتِ غم سے پھر ہم نغمۂ منزل بدلتے ہیں

محبّت میں ذرا سی بات بنتی ہے سببِ غم کا
ذرا سے غم سے اطوارِ نگاہ و دِل بدلتے ہیں

نہیں ذوقِ طلب شائستۂ سوزِ طلب جن کا!
کبھی منزل کبھی تخمینۂ منزل بدلتے ہیں
نہ اکتائیں گے دل یکسانیت سے تابکے آخر؟
وہ روز اک سرخیٔ افسانۂ محفل بدلتے ہیں
سمجھ کر پھول انگاروں کے دھوکے میں نہ آجانا
یہاں بہروپ لاکھوں جلوۂ باطل بدلتے ہیں
تجلّی بنگئی ہے خود طلب یہ کیا مقام آیا
جدھر ہم ہیں ادھر ہی وہ رُخِ محمل بدلتے ہیں
کہاں مارا ہے لاکر آدمیّت کی تمنّا نے
یہاں تو مُنصفوں کے فیصلے قاتل بدلتے ہیں
یہ قائد؟ یہ تقدُّس کے مجاور دین کے تاجر!
وہ انساں اَور ہوتے ہیں جو مستقبل بدلتے ہیں
ضیا اندر ضیا، پیغام در پیغام ارے توبہ
نقابِ رُخ نہیں وہ جلوۂ حائل بدلتے ہیں
مجھے احساؔن یہ ماحول کیونکر راس آئیگا
یہاں تو لوگ تعریفِ حق و باطل بدلتے ہیں

○

جہاں کُشتگانِ ستم سو رہے ہیں
تہِ خاک لاکھوں ارم سو رہے ہیں

ہے نیند ان کی جاگی ہوئی انکھڑیوں میں
کہ نغمات کے زیر و بم سو رہے ہیں

تب ہی کے آثار ہیں پاسبانو
یہ تم نیند میں ہو کہ ہم سو رہے ہیں

جگاؤ نہ دل خستگانِ وفا کو
نہ جانے لیے کتنے غم سو رہے ہیں

کہاں راہ پوچھیں کسے ہم پکاریں
یہاں سب کے سب بیش و کم سو رہے ہیں

حرم ہی میں کب ہو رہا ہے چراغاں
اگر بتکدوں میں صنم سو رہے ہیں

مجھے اب تو منزل سے آواز دے لو
نظر تھک چکی ہے قدم سو رہے ہیں

گجر بج رہا ہے مگر کیا ستم ہے
کہ سب پاسبانِ حرم سو رہے ہیں

غم عشق ہے یا جدائی کا صدمہ
کئی روز سے آپ کم سو رہے ہیں

وہ اب دن کہاں رُوزیاروں میں دانشؔ
ہم اٹھ رہے ہیں ہم سو رہے ہیں !

○

ضبطِ غم کو سوزِ غم کا ترجماں سمجھا تھا مَیں
بے زبانی کو محبّت کی زباں سمجھا تھا میں
شکوہ غم کو حسابِ دوستاں سمجھا تھا مَیں
اُن کے دل کو اپنے دل کا ترجماں سمجھا تھا میں
آفریں ذوقِ تجسّس مرحبا ذوقِ جنوں
زندگی کو کارِ دشوار و گراں سمجھا تھا میں
اُن کے ہاتھوں سے بُجھے ہیں لالہ و گل کے چراغ
جن کو تعمیرِ چمن کا پاسباں سمجھا تھا مَیں
عشق، بن کر رہ گیا ہے ایک دو منزل کے بعد
حُسن، جس کو کارواں در کارواں سمجھا تھا میں
اپنے آغازِ سفر کی صبح پر ملتا ہوں ہاتھ
شامِ منزل کو نشاطِ کارواں سمجھا تھا میں
کیا خبر تھی ہے یہی تعمیرِ عقبےٰ کی اساس
زندگی کو ایک خوابِ رائیگاں سمجھا تھا میں

شوقِ منزل میں ہوا کے رخ کو پہچانے بغیر
اک غبارِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

اس گلستاں میں نشیمن سے قفس ہے پُرسکوں
جس گلستاں میں قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں

متن سے خوابوں کے دیباچے تجاوُز کر گئے
اس نظر کو اک نگاہِ ناگہاں سمجھا تھا میں

ان کی تجویزوں میں بتخانے کی آبادی بھی تھی
جن مشائخ کو حرم کا پاسباں سمجھا تھا میں

ہو گئی اک عمر آنکھوں سے لہو روتے ہوئے
فرصتِ ہستی بقدرِ یک فغاں سمجھا تھا میں

وضعداری تا بکے دانش لبادے ڈالتی
دوستی میں وہ وہیں نکلے جہاں سمجھا تھا میں

○

ہم خود کو زندگی سے خفا جانتے نہیں
نامعتبر نظامِ وفا جانتے نہیں

وہ ان کے اعتماد پہ نازاں ہیں آج کل!
جو عشق کو ہوس کے سوا جانتے نہیں

جن راستوں پہ جان چھڑکتی ہیں منزلیں
ان راستوں کو راہنما جانتے نہیں

پھولوں کا کام صرف ہنسی ہے بہار میں
مسکی کہاں سے کس کی قبا جانتے نہیں

رکھتے ہیں جن سے دادِ وفا کی ہم آرزو
وہ لوگ تو خدا کو خدا جانتے نہیں

اپنی طرف سے وہ ہمیں مایوس کر چکے
ہم ہیں کہ اب بھی ان کو خفا جانتے نہیں

روحیں تو مطمئن ہیں مگر زندگی عذاب
جو اِن بتانِ نَو کو خدا جانتے ہیں!

وہ خوش ہیں اپنے حلقۂ احباب میں مگر
کیا کہہ رہی ہے خلقِ خدا جانتے نہیں

روشن ہیں ہم پہ آپ کی مجبوریاں تمام
ہم شکوہ بر بنائے وفا جانتے نہیں

جو آج بادِ فنا ہیں پریشاں ہیں مستقل
اب لوگ احترامِ وفا جانتے نہیں

ہم اور سزائے دار؟ غلط ہے خطا معاف
اہلِ خرد جنوں کی بنا جانتے نہیں

نقدِ چمن کا حق اُنہیں حاصل ہے آجکل
جو رشتۂ سموم و صبا جانتے نہیں

تم کیا ہمیں جھکاؤ گے لاشوں کے سامنے
رکھتے ہیں ہم بھی اپنا خدا "جانتے نہیں"؟

اہلِ قفس تڑپ تو رہے ہیں مگر غریب
ہے آج کیا چمن کی ہوا جانتے نہیں

احسان جن سے قافلے والے ہیں باخبر
اُن رہزنوں کو راہنما جانتے نہیں!

○

روزِ اوّل سے وفاؤں کا جفا انجام ہے
جانے اس رخ پر بھی کوئی گردشِ ایام ہے
دوستوں کا ذکر کیا، دورِ غمِ آلام ہے
اپنے ہو جاتے ہیں بیگانے یہ وہ ہنگام ہے
خیر و شر دونوں حسیں، لیکن جدا انجام ہے
اک ستارہ صبح کا، اک آفتابِ شام ہے
ہر نفس نامعتبر ہے، ہر نظر ناکام ہے
زندگی کس نامراد آغاز کا انجام ہے
صبحِ نَو کا شور کانوں میں ہے آنکھوں میں ہے خواب
نزع کی منزل میں میرے کارواں کی شام ہے
اپنے آئینے سے اب تک کھیلتا آیا ہے عشق
حسن اک معیارِ احساس و یقیں کا نام ہے
ہر قدم پر اک جہاں ہے ہر جہاں بے اختتام
فاصلہ یوں تو ازل سے تا اَبد دو گام ہے

حسن کی جو زد پہ آجائے وہی جزوِ جمال
عشق کا پیغام جو حُسن لے، اُسی کے نام ہے!

گُل سے گُل، کانٹے سے کانٹا، ہے یہ فطرت کا اصُول
زندگی کا ہر جہت سے زندگی انجام ہے

پرتوِ آئینہ دیگر، آئینہ چیزے دِگر
خود وہ پردوں میں ہیں پردوں کا تعارُف عام ہے

ہائے وہ مشرب بتوں پر ہے پرستاروں کو ناز
آہ یہ مسلک کہ بندوں میں خُدا بدنام ہے

آشیانوں میں ابھی ہیں جُوں کے توں زاغ و زغن
یا بہار آئی نہیں یا آتشِ گُل خام ہے

کون دیتا ہے وفاؤں کا وفاؤں سے جواب
شکوۂ دنیا نہ کر دنیا اسی کا نام ہے!

شکوۂ صرصر عبث اے خوشنوایانِ بہار
ہر بلندی کے نشیمن کا یہی انجام ہے

کچھ محبت لے گئی احسان کچھ تقسیمِ ملک
اب مرا سرمایہ لے دیکر خدا کا نام ہے

○

کِس کی یاد آئی کہ خود کو بے وفا کہنے لگے
بیٹھے بیٹھے کیا ہوا تم کو یہ کیا کہنے لگے

کیا ہوا دنیا کو، کل تک کجروی تھا جس کا نام
آج اسے حُسنِ تمدّن کی ہوَا کہنے لگے!

کِس قدر خوش فکر و خوش بیں ہیں اسیرانِ قفس
آشیانوں سے دُھواں اٹھّا، گھٹا کہنے لگے!

روز کے شکووں کا جو انجام ہونا تھا ہُوا
اب ہم ان کی بے وفائی کو وفا کہنے لگے

جوشِ طوفاں سے مِلا جرأت کی خامی کا ثبوت
ناخدا کو لوگ گھبرا کر خدا کہنے لگے!

جب بُرے ہیں ہم، وہ اچھا کس لئے کہتے ہمیں
وہ جب اچّھے ہیں اُنہیں ہم کیوں بُرا کہنے لگے!

بدگمانی نے تراشے اُن پہ لاکھوں اتہام
جو کسی نے ہم سے آ کر کہہ دیا کہنے لگے!

حسن کو اُس عشق کا واجب نہیں ہے احترام
جو مقاصد کے تحفّظ کو دفا کہنے لگے!

جس کے آذر نے حرم والوں پہ توڑے ہیں ستم
ہم بہ جبرِ وقت اُس بت کو خدا کہنے لگے

دِل دہل اُٹھتا ہے تم لیتے ہو جب ہنس کر سلام
جانے کیا سمجھے زمانہ، جانے کیا کہنے لگے

کتنے چہروں پر غریبوں کا لہو ہے جس کو لوگ
اصطلاحاً غازۂ آب و ہوا کہنے لگے

عشق سے احساںؔ دانش باز آئیگا کہیں
وہ تو دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا کہنے لگے

انجمن ترقی اردو ... نئی دہلی

○

جس راہ پہ لوگ چل رہے ہیں — منزل سے نظر بدل رہے ہیں
احباب بھی، اقربا بھی، وہ بھی — سب وقت کے ساتھ چل رہے ہیں
گلشن میں شفق کا خون پی کر — غنچوں کے چراغ جل رہے ہیں
ذہنوں پہ نکل رہا ہے سورج — ظلمت کے پہاڑ گل رہے ہیں
یارب یہ نئی سحر ہے کیسی — خوابوں کے دیار جل رہے ہیں
قسمت ہے انہیں کی رہ نمائی — گر گر کے جو اب سنبھل رہے ہیں
کیا حسن کا ذکر، عشق کے بھی — دستورِ نظر بدل رہے ہیں
گلچیں کے محل میں ہے چراغاں — کلیوں کے سہاگ جل رہے ہیں
یاروں نے تو جا لیے ستارے — ہم راہ میں پاؤں مل رہے ہیں
کھوٹے جنہیں کہہ گیا مبصّر — سکّے وہی آج چل رہے ہیں
پروانہ نہیں کوئی میسّر! — انجم کے چراغ جل رہے ہیں
کانٹے جو چمن میں سرخرو ہیں — پھولوں کے لہو سے پل رہے ہیں

اے باغ کے تاجرانِ خوش وقت کیوں پھول لہو اگل رہے ہیں!
ہر شاخ سے بے کھلے ہی غنچے آنسو کی طرح سے ڈھل رہے ہیں
ثابت قدم رہِ محبت! وہ آج ہیں اور نہ کل رہے ہیں
کیا کرتے حصولِ علم احسان ہم وقفِ رہِ عمل رہے ہیں

احساں وُہ ملتفت ہیں جب سے
احباب تمام جل رہے ہیں

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

○

جو وقت گزر رہا ہے ہمدم — ہر زخم کا بن رہا ہے مرہم
دل عشق کا جل رہا ہے لیکن — لَو حُسن کی ہو رہی ہے مدھم
ماضی سے جو حال کو نہ پرکھیں — اے دورِ زمانہ وہ نہیں ہم
ہر ساز سے سوز چھن رہا ہے — نغموں میں بہک رہی ہے سرگم
خوش کُن ہیں ہزار وقت کے راگ — رکتا نہیں زندگی کا ماتم
ہے حُسن جوان، عشق تازہ — بنیادِ وفا اگر ہو محکم!
صد کوششِ انبیا کے باوصف — آدم ہے ہنوز ننگِ آدم
کہہ عشق کے سوز کو نہ تکلیف — یہ آگ ہے زندگی کا مرہم
پھولوں کی ہنسی پہ مرنے والو — گزری ہے تڑپ تڑپ کے شبنم
کیا قیمتِ اشک سے ہو آگاہ — وہ دل جو نہیں ہے غم کا محرم
ہونے تو دو حُسن کو سُبک گام — ہو جائے گا عشق خود بخود کم!

وہ اور شعورِ دوستداری
کس وہم میں مبتلا تھے یہ ہم!

اشکوں کی چھلک نہ عزمِ فریاد
اللہ رے دل کی وسعتِ غم!

پچھتاؤ گے بے رخی پہ اپنی
ہے اہلِ وفا کی زندگی کم

گردوں پہ کمند پھینکتا ہے
اللہ رے مجالِ ابنِ آدم

اے کاش! کوئی ہمیں سمجھ لے
اک عظمتِ انقلاب ہیں ہم

مُطرب ہی نہیں تو کون سوچے
کیوں سازِ میں سوز ہو گیا کم

مَیں تجربتاً ہنستا تھا لیکن
ہنسنے سے تو اور بڑھ گیا غم!

دنیا کو اِرم سمجھنے والو
دنیا سے الگ نہیں جہنّم

ہم بندۂ بے نیازِ دانش
جینے کی خوشی نہ موت کا غم

دے کے توفیقِ نظر جلووں کو ارزاں کر دیا
زندگی بخشی، مگر مرنے کا ساماں کر دیا!

آج تک وہ بے نشاں ہے، آج تک پردے میں ہے
جس نے خود کو ذرّے ذرّے سے نمایاں کر دیا

اہلِ گلشن کو نہیں بربادیٔ گلشن کا غم
باغبانوں نے یہ کیا نظمِ گلستاں کر دیا

روح کو دے کر مشیّت نے لباسِ آب و گل
لامکاں کو بھی شریکِ بزمِ امکاں کر دیا؟

ہوش لے کر جلوۂ دیدار، یہ اچھّی کہی!
آئینے پر کیا نوازش کی جو حیراں کر دیا

روشنی میں جس کی ڈھلتے ہیں تباہی کے اصول
وہ چراغ اب میرِ محفل نے فروزاں کر دیا

ناتمام اک مسکراہٹ، عشق نے دی تھی مگر
عمر بھر کو حسن نے رونے کا ساماں کر دیا

باغباں نے جانے کیوں حدِ گلستاں کی قبول
جانے کیوں نغموں کو محصورِ گلستاں کر دیا

یہ بھی دَور آیا کہ آنکھیں پھیر لیں احباب نے
یہ بھی دیکھا ہے کہ بے دردوں نے درماں کر دیا
جنبشِ لب، ضبط میں تحریکِ گریہ بن گئی!
مسکرا کر ہم نے خود غم کو نمایاں کر دیا
ناتواں ذرّے حریفِ کوہ و صحرا بن گئے
تم نے جس گل کو ہَوا دے دی گلستاں کر دیا
آب و گل تاریکیوں کے ڈھیر تھے تیرے بغیر
تو نے دنیا کو زیارت گاہِ انساں کر دیا
پُرسشِ غم سے بڑھا ہے اَور دل کا اضطراب
تم نے آ کر کونسی مشکل کو آساں کر دیا
اُن میں تخریبِ چمن کے مشورے بیجا نہیں
موسمِ گل نے جنہیں سر در گریباں کر دیا
منہ دکھانا ہے جنوں کو بھی تو دیوانو کبھی،
آ کے زنداں سے نظر انداز زنداں کر دیا!
ذکر پھولوں کا تو کیا احسانؔ جب موج آ گئی
ہم نے گونگے آبشاروں کو غزلخواں کر دیا

○

اِدھر وفا ہے اُدھر بے رُخی ہے نخوت ہے
بایں سلوکِ محبّت وہی محبّت ہے !
مری نظر میں ہیں آدابِ زائرانِ حرم
مگر مجھے تو ترے آستاں سے نسبت ہے
غلامِ صرصرِ غم ہے یہاں نسیمِ شمال
یہاں چراغ جلانا بھی کارِ ہمّت ہے !
وہ دوست جنکے ہیں جتنے ہیں ہم کو ہے معلوم
کہ اک زمانے سے حاصل ہمیں بھی قُربت ہے
کہاں یہ چھوڑ گئی لا کے جستجوئے سکوں
یہاں تو دین ہو یا عشق، سب تجارت ہے
ہے میرے ذوقِ نظر کی بھی اس میں رسوائی !
یہ کس زبان سے کہدوں وہ بے مروّت ہے

بجا بجا کہ یہاں ڈھل رہے ہیں سیّارے
مگر مآل تو ہر روشنی کا ظلمت ہے!
کسی طرح کِسی انسان کو خُدا کہنا
مری نظر میں یہ توہینِ آدمیّت ہے
ہے یہ بھی عظمتِ دولت کے جانچنے کا اصول
یہ دیکھ کتنے شریفوں کے پاس دولت ہے
اگر فضا ہے مکدّر تو کیا یہاں نہ رہوں؛
یہ جھٹپٹا تو مری روشنی کی قیمت ہے!
ہے میرا کام اصولِ حیات پر تنقید
مرے جنوں کے لیے عقل اک شریعت ہے
اِدھر گلے میں ہیں بانہیں ادھر نگاہ سے بات
یہ دوستی ہے کہ اس دور کی سیاست ہے
مرا قصور یہی ہے یہی خطا دانشؔ!
مرا کلام جوانوں کو درسِ جُرأت ہے

○

کہاں کا حشر کیا روزِ جزا کچھ لوگ کہتے ہیں
کہ ہستی خود ہے ہستی کا صِلہ کچھ لوگ کہتے ہیں

ادائے حُسن بدلی، ناز بدلے، انجمن بدلی
وفا لیکن ابھی تک ہے وفا، کچھ لوگ کہتے ہیں

چراغوں کی ضیا دھندلی، ترانوں کے اثر پھیکے
اکھڑنے کو ہے محفل کی ہوا کچھ لوگ کہتے ہیں

بزعمِ خود جنہیں گمراہ کہتے ہیں نئے رہزن
وہ دیوانے ہیں منزل آشنا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں

نتیجہ آگ ہو یا خون، زنداں ہو کہ مظلومی!
یہاں پھر ہو گا ہنگامہ بپا کچھ لوگ کہتے ہیں

سرِ بالیں کیا ہے جمع جن کو دردمندوں نے
نہیں یہ چارہ گر درد آشنا کچھ لوگ کہتے ہیں

اگر قدرِ شرافت کو بدل سکتے نہیں قائد
نہ ہوگا پھر کوئی مشکلکشا کچھ لوگ کہتے ہیں

جنہیں بخشا گیا ہے منصبِ تقسیمِ حق داری
نہیں ان میں کوئی حق آشنا کچھ لوگ کہتے ہیں

رہائی چاہتے تھے جو چمن میں سبزہ و گل کی
وہ مجرم بھی کبھی ہونگے رہا کچھ لوگ کہتے ہیں

میں کیوں نرگس کو دیکھوں، گریۂ شبنم پہ کیوں جاؤں
کہ ہر گل ہے کسی کا نقشِ پا کچھ لوگ کہتے ہیں

نہیں ہے کارواں کوئی تو مایوسی کے کیا معنی
کہ خود ذوقِ سفر ہے رہنما کچھ لوگ کہتے ہیں

حقارت سے نہ دیکھو نامرادوں ناامیدوں کو
انہیں بندوں میں ملتا ہے خدا کچھ لوگ کہتے ہیں

جسے دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہیں ڈھونڈنے والے
وہ ہے دیر و حرم سے ماورا کچھ لوگ کہتے ہیں

کہاں کے راستے، بانگِ جرس کیا، منزلیں کیسی
یہ سب کچھ ہے فریبِ راہنما کچھ لوگ کہتے ہیں

وفا ہے جُرم جن کے خاندانوں کی رُوایت ہیں
بنائیں گے وہ دستورِ وفا کچھ لوگ کہتے ہیں

زباں تک ہی نہیں محدود عرضِ غم محبت میں
نگاہِ عشق بھی ہے التجا کچھ لوگ کہتے ہیں

خداوندانِ نعمت جن کے منصوبوں سے نالاں ہیں
ہیں ان میں بیشتر اہلِ وفا کچھ لوگ کہتے ہیں

ہمارا بھی تو سر احساں جھکتا ہے کسی در پر
ہمارا بھی تو ہے آخر خدا کچھ لوگ کہتے ہیں

○

پیدا ترے اشکوں میں اثر کون کرے گا
اس شام کی شبنم کو شرر کون کرے گا

اس دَور کی تخصیص ہے آسان پسندی
دشوارِیِ ہستی پہ نظر کون کرے گا

سمتوں ہی سے واقف نہ ستاروں سے خبردار
یہ راہنما ہیں تو سفر کون کرے گا

تاروں کی ضیا کم ہے نہ زخموں کی کسک بند
اس حال میں امّیدِ سحر کون کرے گا

اُٹھے کوئی آذر کدۂ نو سے براہیم
اس آگ کو گلزارِ نظر کون کرے گا

اے اہلِ محبت نہ ہنسی حد سے بڑھاؤ
غم بھی تو مُہِم ہے اسے سر کون کرے گا

ہر موڑ پہ منزل کے دیئے کیسے جلیں گے
جُرأت یہ سرِ راہگزر کون کرے گا!

ہوتے رہے قائم جو بہائم کے ادارے
اندازۂ نقصانِ بشر کون کرے گا

سیراب کیا ہو جسے انساں کے لہو سے
اس خاک سے پیدا گلِ تر کون کرے گا

جس راہ کی ظلمت نہ جنے انجم و خورشید
منزل کے تصوّر سے سفر کون کرے گا

سچ جان کہ اس انجمنِ دار و رسن میں
ممکن تو ہے ہر بات، مگر کون کرے گا

بنتے ہوں جہاں زاغ و زغن ہی کے نشیمن
پھولوں کی تباہی پہ نظر کون کرے گا

دیوانے جہاں نقشِ قدم چھوڑ گئے ہیں
معدوم وہ اب راہگزر کون کرے گا

ہے کوئی جو تنہائیٔ زنداں سے نہ گھبرائے
تقسیم یہاں فکر و نظر کون کرے گا

فاقوں میں بھی احسان رہا فن کا پرستار ،
اس ملک میں یوں عمر بسر کون کرے گا !

وعدہ نہ سہی یونہی چلے آؤ کسی دن
گیسو میرے دالان میں لہراؤ کسی دن

سن سن کے حریفوں کے تراشے ہوئے الزام
معیارِ حریفاں پہ نہ آجاؤ کسی دن

کیوں ہم کو سمجھتا ہے وہ دو قالب یکجان
خوش فہم زمانے کو تو سمجھاؤ کسی دن

کچھ رند بھی ہیں خاک بسر چشم بہ دہلیز
میخانے کی جانب بھی نکل آؤ کسی دن

جھونکوں کی کلائی کو جھٹک کیوں نہیں دیتے
کیا ہے جو پھواروں میں چلے آؤ کسی دن

گتھی طلب و ترک کی کھلتی ہی رہے گی
اس عقدہ ہستی کو تو سلجھاؤ کسی دن

ہنستے ہو مرے حالِ پریشاں پہ تو ہنس لو
اس کا بھی تو امکان ہے پچھتاؤ کسی دن

ٹھکراتے ہو ٹھکراؤ بساطِ مے و مینا!
ٹھوکر کسی انساں سے نہ کھاجاؤ کسی دن

بیکار پڑے ہیں نگہِ شوق کے بجرے
اس بحر میں طوفاں بھی کوئی لاؤ کسی دن

ہیں جبکہ مہ و مہر ضیا خواہ تمہیں سے
لَو میرے دیئے کی بھی تو اکساؤ کسی دن

تا چند یہی جشنِ بہاراں کے دف و نَے
سینوں کے الاؤ بھی تو سلگاؤ کسی دن

کمتاب ہیں اشکوں سے نم آلود نگاہیں
آئینۂ امّید کو دہکاؤ کسی دن!

یہ خشک جزیرے کہیں پتھر ہی نہ بن جائیں
آنکھیں جو عطا کی ہیں نظر آؤ کسی دن

یہ زخم طلب کاوشِ ناخن پہ نہ آجائے
اس گھاؤ کو مرہم سے بھی سلگاؤ کسی دن

دانش ہی کے اشعار ہیں دانش ہی کے اذکار
ایسا نہ ہو دانش ہی کے ہو جاؤ کسی دن!

○

یارانِ دھر پر نہ خوشی کا مدار رکھ
پیشِ نگاہ رحمتِ پروردگار رکھ

حساس دل کا عرش سے رشتہ ہے بالیقیں
اس آئینے کو زنگ نہ دے بے غبار رکھ

یہ حُسن کی خطا نہ حریفوں کا کچھ قصور
کس نے کہا تھا دل پہ تمنّا کا بار رکھ

اپنے بھی بازوؤں پہ بھروسا بُرا نہیں
امدادِ غیر پر بھی یقیں استوار رکھ

اس قریۂ خرد میں وفا آشنا کہاں؟
جو ہو جنوں شناس اسے غمگسار رکھ

وہ آئیں یا نہ آئیں رکیں یا نہ رک سکیں
پھر بھی تو اپنی رہگزرِ دل سنوار رکھ

یہ بارِ زندگی ہے لحد تک دبالِ دوش
تو لاکھ بار بار اٹھا بار بار رکھ!

جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کیا جام کیا جمال
ساقی ہزار لا کے مئے خوش گوار رکھ

پھر دیکھ تیری سمت وہ بڑھتے ہیں کس طرح
ان کی طرف قدم کوئی دیوانہ وار رکھ

شکوہ زباں پہ ہو نہ جبیں پر شکن پڑے
اتنی تو احتیاط غمِ روزگار رکھ

اُس کی گلی تو کانِ نمک ہے خدا گواہ
اپنی بساط تک طلبِ حُسنِ یار رکھ

لاؤں کہاں سے شکر کے قابل زبان و دل
مجھ پر بقدرِ تاب و تواں غم کا بار رکھ

مانے مری تو سازشِ ماحول تک نہ جا
مری سُنے تو وردِ زباں ذکرِ یار رکھ!

خونِ گل و سمن سے ہے رنگیں روشِ روش
لیکن بایں فضا بھی امیدِ بہار رکھ

یہ تو خوشی ہے آج میسّر ہے کل نہیں!
غم اتنا بے ثبات نہیں اعتبار رکھ

دیتا ہے کون کس کو یہاں آرزو کی بھیک
دانشؔ خدا کے فضل و کرم پر مدار رکھ!

ازل سے آدمی ہے خدا کی تلاش میں
جلوہ ہے اپنے جلوہ نما کی تلاش میں

دل کو سرورِ شبلی و سرمد کی جستجو
آنکھیں نگارِ لالہ قبا کی تلاش میں

میں اس جگہ ہوں کہ رب پیمبر سے سرفراز
خود چارہ گر جہاں ہے دوا کی تلاش میں

جب ان سے پہلی بار ملی تھی نگاہِ شوق
ابتک ہے دل اس آب و ہوا کی تلاش میں

ہونگے وہ کوئی جن کو ملی رہنما سے راہ
ہم کھو گئے ہیں راہ نما کی تلاش میں

اِس میری جستجو کا نہ جانے ہو کیا مآل
نکلا ہوں میں حرم سے خدا کی تلاش میں

یہ اور بات ہے کہ میسّر نہیں کہیں
ہم اہلِ دل ہیں جنسِ وفا کی تلاش میں

قسمت بُری تھی گرم بگولوں نے آ لیا
آئے تھے ہم تو بادِ صبا کی تلاش میں

کس سامری نے دھول یہ آنکھوں میں جھونک دی
انساں ہے خوار اپنی اَنا کی تلاش میں

دانش یہاں بُتوں کا نظارا بھی ہے بہت
تم گھر سے چل پڑے ہو خدا کی تلاش میں

رُوداد

جِدھر دیکھو اُدھر انسانیت کو
پریشانی میں ڈالا جا رہا ہے
رعایا کے لہُو کی بھینٹ دے کر
تمدّن کو سنبھالا جا رہا ہے!

دئے جاتے ہیں نا اہلوں کو منصب
ہمیں وعدوں پہ ٹالا جا رہا ہے
سلامت آبرو فردا کی یارب!
نیا دستور ڈھالا جا رہا ہے!

نئے خُداوندانِ سیاست سے

پیغامبرِ مہر و وفا ہو بھی سکو گے ؟

اِنسان ہو اِنساں پہ فدا ہو بھی سکو گے

جس پاک تصوّر پہ یہ بنیادِ سفر ہے

اُس منزلِ مقصد پہ رسا ہو بھی سکو گے

کر سکتے بھی ہو پرورشِ کشتِ تبسّم

برہم زنِ اندوہ و عزا ہو بھی سکو گے

شاداب ہوں جس لے سے محل و لالہ و نسریں

اس لَے میں یہاں نغمہ سَرا ہو بھی سکو گے

اوّل سے ہو دِلدادۂ رقص و لب و رخسار

اب صاحبِ اخلاق و عطا ہو بھی سکو گے

حقداروں کا حق کھا کے شفق رنگ ہیں چہرے
اب تائبِ آزار و جفا ہو بھی سکو گے

چھوٹے گی بھی بیواؤں یتیموں کی تجارت
دامِ زر و گوہر سے رہا ہو بھی سکو گے

عُقبےٰ کے اِرم سے تو بُلاوا ہے سبھی کو
دنیا کی بہشتوں سے خفا ہو بھی سکو گے؟

جب چرخ پہ تارے ہوں نہ جنگل میں کہیں آگ
اس وقت میں تم راہنما ہو بھی سکو گے

جمہور کی تنظیم ہے اک جزوِ نبوّت!
اس فرض سے تم عُہدہ برا ہو بھی سکو گے

اِنسان کو انسان بنانے کے جنوں میں
زنجیرِ تعصُّب سے رہا ہو بھی سکو گے؟

دِل میں کہیں گُنجائشِ حق مل بھی سکے گی
باطِل کے لیے برقِ بلا ہو بھی سکو گے

تاریخ پہ دھبّا تو نہ ہو گا یہ تغیُّر؟
اک تازہ تمدُّن کی بِنا ہو بھی سکو گے

ٹوٹیں گی سروں پر جو مصائب کی چٹانیں
اس حال پہ راضی بہ رضا ہو بھی سکو گے؟

پھولوں کی طرح خار بھی حقدارِ چمن ہیں
ایثار میں مانندِ صبا ہو بھی سکو گے

آسان نہیں شرعِ محمّد کا تحفّظ
منجملہ اربابِ وفا ہو بھی سکو گے

ذرّات سے لے کر مہ و انجم کے جہاں تک
نبّاضِ دلِ ارض و سما ہو بھی سکو گے،

جس اَوج پہ انسان ہے اک عصمتِ یزداں
اُس اَوج پہ تم بال کُشا ہو بھی سکو گے

کب سے ہے تمہیں چاٹ غریبوں کے لہو کی
میخانہ و ساقی سے جُدا ہو بھی سکو گے

مانا کہ جنوں ہے تمہیں تبلیغِ وفا کا!
خود عامِل دستورِ وفا ہو بھی سکو گے،

جس وقت پکاریں گے شہادت کے تقاضے
بڑھ کر بخوشی لالہ قبا ہو بھی سکو گے؟

اے سجدہ گزارانِ درِ دولت و جبروت
تم قبلہ رُخ و قبلہ نُما ہو بھی سکو گے ؟

سر لے تو رہے ہو یہ خدائی کا بکھیڑا
انصاف سے سوچو کہ خُدا ہو بھی سکو گے

احساںؔ تو اک دردِ مجسّم ہے مری جاں !
اس دردِ مجسّم کی دوا ہو بھی سکو گے

آجکل

ایسا نظامِ گردشِ دوراں ہے آجکل
امن و فساد، دست و گریباں ہے آجکل

کلیاں ہیں دِلفگار، لہورو رہے ہیں پھول
برہم تمام بزمِ گلستاں ہے آج کل!

"امروز" سوگوار ہے "فردا" ہے بے چراغ
صبحِ وطن میں شامِ غریباں ہے آجکل

سب سینہ چاک ہیں کوئی پُرسانِ غم نہیں
بے حشر ایک حشر کا ساماں ہے آجکل

آبادیوں پہ چھائے ہوئے ہیں دھوئیں کے ابر
شعلوں کی نذرِ خرمنِ دہقاں ہے آجکل

غلّہ گراں، سکون گراں، زندگی گراں
اک خونِ آدمی ہے جو ارزاں ہے آجکل

گھر گھر، گلی گلی میں ہیں مشہد بنے ہوئے
رستوں میں عام خونِ شہیداں ہے آجکل

مزدور کے شکستہ گھروندے کا ذکر کیا
محرومِ شمع، قصرِ سلیماں ہے آج کل

ہر ذرّہ آسماں کی طرح ہے تباہ کار!
اُن مرحلوں میں گردشِ دوراں ہے آجکل

جو مَوت تھی سکونِ شہادت لیے ہوئے
وہ مَوت خود خراب و پریشاں ہے آجکل

ہے متّصِل فضا میں سراسیمگی کا رنگ!
بستی نہیں ہے شہرِ خموشاں ہے آجکل

احساں ہر طرف ہے لہُو ہی لہُو مگر!
شاعر اُسی طرح سے غزلخواں ہے آجکل

مداری

ڈھل گیا سورج، تپش کم ہو گئی لیکن ابھی
خاک کے سینے میں سوزاں ہے مسلسل آگ سی

یہ محلّہ جس میں بے برگ و نوا مزدور ہیں
سرخوشوں کو دیکھتے ہیں سرخوشی سے دور ہیں

آ کے ملتا ہے جہاں دو تنگ گلیوں کا سِرا!
اور وہیں سے ایک ہو کر بڑھ گیا ہے راستا

اک مداری اس طرح دکھلا رہا ہے اپنا کھیل
پڑ رہی ہے دل میں بچّوں کے خوشی کی داغ بیل،

ان کے بچّوں کی کہ جن کی زندگی کی شاہراہ
کوئی سرمایہ نہیں رکھتی بجز فریاد و آہ!

بیکلی نے صبر کے رستے پہ ڈالا ہے جنہیں
بے بسی نے ضبط کے سانچے میں ڈھالا ہے جنہیں

جن کے حصّے کا کہیں خوفِ خدا باقی نہیں
منصفی میں، جن کے حق کا فیصلہ باقی نہیں
جن کی مایوسی نہیں رکھتی خوشی کی آرزو،
بے طرح ارزاں ہے جن کے دست و بازو کا لہو
اے مداری گائے جا ڈفلی بجا کر گائے جا
ان غریبوں کے جگر پاروں کے دل بہلائے جا!
جانے پھر ان کو کشاکش، یہ تبسم دے نہ دے
ڈگڈگی کی تال بنسی کا ترنّم دے نہ دے!
ان کے ہونٹوں پر نہ جانے پھر ہنسی آئے نہ آئے
زندگی پر آب و رنگِ زندگی آئے نہ آئے!
جانے ان کو وقت کوئی قہقہہ دے یا نہ دے
خود غرض قانون، محنت کا صلہ دے یا نہ دے
ان کی فہرستِ پریشانی میں راحت ہو نہ ہو
عمر بھر پھر ان کو یوں ہنسنے کی فرصت ہو نہ ہو
ان کی ظلمت میں فرشتے روشنی لکھتے نہیں
نوجوانوں کی جوانی میں خوشی لکھتے نہیں!

یومِ اقبالؒ پر

وہ ایک چشمہ جو اُترا تھا کوہساروں سے
وہ اک شرار جو پھوٹا تھا سنگ پاروں سے

وہ اک دیا جو جلا شب نما سویروں میں
وہ اک کرن جو ہنسی منجمد اندھیروں میں

وہ ایک چاند جو دریا کا دِل بڑھا کے چھپا
وہ اک ستارہ جو ظلمت پہ مُسکرا کے چھُپا

وہ ایک کوندا جو پَل میں لپک کے بیٹھ گیا
وہ اک شرر جو دھوئیں میں چمک کے بیٹھ گیا

وہ اک شہاب جو گردوں سے ٹُوٹ کر نہ پھرا
وہ تیر قوسِ قزح سے جو چھوٹ کر نہ پھرا

وہ ناخُدا جسے ساحِل کا رنج مار گیا!
جو ڈوب کر بھی سفینے کو پار اُتار گیا
وہ زمزمہ لبِ رادی پہ جو تمام ہوا
وہ اک جنون جو یزداں سے ہمکلام ہوا
وہ ایک صاحبِ منزل جو کارواں میں نہیں
وہ اک لطافتِ عنواں جو داستاں میں نہیں
وہ باغباں جسے مارا ہے لالہ و گُل نے!
سکوتِ سرد و سمن نے فغانِ بلبل نے
وہ رند جب سے خراباتِ زندگی میں نہیں
خودی کا شور کسی بزمِ بے خودی میں نہیں
وہاں تو قبر میں میلا نہیں ہوا ہے کفن
یہاں بگڑ بھی چکا اہلِ انجمن کا چلن
یہ خودسری کی خود آرائیوں کی وادی ہے،
یہاں خوشی ہی نہیں غم بھی انفرادی ہے!
دلوں میں نقشِ عقیدت نظر فروز نہیں
غلیظ خاک کو حاصِل سرور و سوز نہیں!

حلال رِزق کے طالِب نہ مِحنتوں کے بدن
چمَن گروں کے لبادوں میں تاجرانِ چمَن
فراخ ظرف کے مالک نہ صاحبِ تجویز!
نہ رہزنی کا سلیقہ نہ رہبری کی تمیز
دِلوں میں سوزِ یقیں ہے نہ عزمِ محکم ہے
یہ زندگی تو نہیں زندگی کا ماتم ہے!
عجب کشاکشِ باہم نے رنگ اچھالا ہے
نہ شام ہے نہ سحَر، ملگجا اجالا ہے!
کِسی کو فِکر نہیں ہے مآل کیا ہوگا
بڑھا یہ زخم تو پھر اندمال کیا ہوگا
مجھے یہ ڈر ہے وطن کا نہ بول دیں نیلام
یہی گناہ کے بندے، یہی غرض کے غلام
دِلوں پہ مُہر نہیں قید کچھ بیاں پہ نہیں
مگر حقائقِ ہستی کِسی زباں پہ نہیں!
کیا ہے اس پہ اراکینِ رعد یہ نے کمال
تاثرات سے کوسوں ہے نغمہ اقبالؒ

خیال تال میں مُدغم ہے رُوح تھاپ میں گم
حیات سازِ نوا کے حسیں ملاپ میں گم
نہ سوز کی کوئی پروا، نہ وقت ہی کا لحاظ
رواں دواں ہیں فضاؤں میں بے چھلے الفاظ
نہ درسگاہِ تفکّر، نہ کارگاہِ عمل !
کہیں دماغ کی اُلجھن، کہیں دلوں کا خلل !
کِسی کی تاب نہیں ہے جو کر سکے مِسمار
روایتوں کے احاطے، وراثتوں کے حِصار
خراش ہے دلِ دانش پہ مملکت کا نظام
فضا شناس حکومت، نہ خود شناس عوام
بقیدِ ہوش یہاں اقتدار بکتے ہیں
فقیہِ شہر تو کیا شہریار بکتے ہیں !

اراکینِ دارالعلوم دیوبند سے

اس میں کیا شک ہے کہ ہے دین کی تعلیم یہاں
اس میں کیا شک ہے کہ ہے علم کا مرکز یہ مقام
ایسے ایسے ہیں یہاں عالمِ تفسیر و حدیث!
آشنا جن کے مراتب سے نہیں سطحِ عوام!
ہو چکے ہیں وہ یہاں صاحبِ اوصاف و عمل!
جن کو دنیا کے امامین نے مانا ہے امام!!
لیکن افسوس کہ اب علم سے ہے دُور عمل!
یہ اگر سچ ہے تو کیا علم نہیں ناقص و خام!
دین جب اپنی مشیری میں سیاست کو نہ لے
واقعہ یہ ہے کہ قوموں کو بناتا ہے غلام،
گر اسانید کی تحصیل ہے بے ذوقِ عمل
علم کا میری نظر میں کوئی رتبہ نہ مقام

ہے یہی وجہ کہ تعمیرِ تمدّن میں شریک !
نہ مدارس کے مدرس، نہ مساجد کے امام

دینِ احمدؐ جسے کہتے ہیں ز قرآن و حدیث
لیکے آیا ہے وہ دنیا میں تب و تابِ دوام

اس سے باہر نہ سیاست ہے نہ صنعت ہے نہ طب !
اس کی فہرست میں ٹوڈی ہیں، نہ جابر نہ غلام

روحِ اسلام بصیرت ہے بدن اس کا عمل
اک طرف جوشِ جہاد، ایک طرف سازِ پیام

کاش اسلام کے نسخہ کی اشاعت ہو درست
کاش اس دورِ غلامی سے شفا پائیں عوام !

کس تحمل سے صحابہؓ نے اٹھایا تھا خمیر!
کن کن اجزاء سے محمدؐ نے بنایا تھا قوام

ساقی

میکدے کا ترے ہوتے یہ نظام اے ساقی!
اب نہ وہ رند، نہ وہ مے، نہ وہ جام اے ساقی
کیا مناسب ہے؛ کہاں جائیں عوام اے ساقی!
اک طرف تیغ ہے، اک سمت ہے جام اے ساقی
کوئی رہبر، نہ مجدّد، نہ امام اے ساقی
سب ہیں تقسیم و حکومت کے غلام اے ساقی
تیرے بیخود، ترے لغزیدہ خرام اے ساقی!
یہی بدلیں گے زمانے کا نظام اے ساقی
ہیں جہاں اہلِ تماشا کی نگاہوں کے ہجوم
وہ نہیں ہے ترے مستوں کا مقام اے ساقی
مدتیں ہو گئیں خاموش ہیں مردانِ جہاد!
کار فرما ہیں غلام ابنِ غلام اے ساقی

مشورے چاند ستاروں میں ہیں آدم کیخلاف
ٹوٹ جائے نہ عناصر کی لگام اے ساقی

ترک و تسلیم میں غلطاں ہیں زمانے کے دماغ
ایسا الجھا ہے تمدّن کا نظام اے ساقی

مُقتدی کیوں نہ رہیں سوزِ یقیں سے محرُوم
جب ہوں خود کام و ریا کار امام اے ساقی

جس میں امروز کا ارماں ہو نہ فردا کی امید
وہ نشہ ہے میرے مشرب میں حرام اے ساقی

رشک کیوں کر نہ کریں رند کہ میخانے میں
سرِ فہرست ہے احسانؔ کا نام اے ساقی

آزادی کے بعد

ہمنشیں شاعرِ مزدور سے حالات نہ پوچھ
کیسی جم جم کے ہوئی خون کی برسات نہ پوچھ
اس قیامت کا ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں
کس قدر کٹ گئے سادات خبر ہے کہ نہیں
کتنے غم ہیں دلِ صد چاک میں معلوم بھی ہے؟
عصمتیں کتنی ملیں خاک میں معلوم بھی ہے؟
کتنے کوثر کے کنول ٹوٹ گئے عام ہوئے
کس قدر پھول سے عارض تھے کہ نیلام ہوئے
کتنی ماؤں کے پھٹے لختِ جگر یاد بھی ہے؟
کتنے تاریک ہوئے شمس و قمر یاد بھی ہے
کتنی بے پردہ خواتین کے نکلے ہیں جلوس
جن میں اب کوئی سہاگن تھی نہ بیوہ نہ عروس؟

اپنے بچوں کو بچاتے ہوئے اِنسان کٹے
حد یہ ہے دودھ ٹپکتے ہُوئے پستان کٹے
جن کے گھر فخر و مباہات کے روشن تھے دِیے
درِ شیطاں پہ وہ مجبُور ہیں سجدوں کیلئے
گال پچکے ہوئے مٹی کے پیالوں کی طرح
پتلیاں آنکھوں کی رِستے ہوُئے چھالوں کی طرح
کیوں نہ ہو آہ وطن ، اپنا وطن چھوڑا ہے
تنت پر آئی بہاروں میں چمن چھوڑا ہے
کھیتیاں چھوڑیں، کنوّیں چھوڑے مکاں چھوڑے ہیں
اپنے اجداد کی قبروں کے نشاں چھوڑے ہیں
کتنی لیلاؤں پہ ٹوٹے ہیں یہاں کوہِ سِتم
کتنی عذراؤں نے توڑا ہے زبوں حال میں دم
سسّیاں کِتنی تھیں پُنّوں جنہیں پا بھی نہ سکے !
کِتنی ہیریں تھیں کہ رانجھے جنہیں لا بھی نہ سکے
سوہنیاں کِتنی مہینوال بسار آتے ہیں
کتنے طوفاں نگہ و دِل پہ گزار آئے ہیں ؟

کتنے جلوے گئے لٹتی ہوئی چیزوں کی طرح
بِک گئیں کتنی زلیخائیں کنیزوں کی طرح
کتنے مہتاب اب آغوش کے ہالوں میں نہیں
کتنے اصنامِ محبّت کے شوالوں میں نہیں
تیز گذری ہے ادھر گردشِ دوراں کتنی
کربلائیں ہیں یہاں خاک میں پنہاں کتنی!

(۲)

دن کی امّید اگر جُرم نہیں رات کے بعد
ہوش درکار تھا اس سختیِ حالات کے بعد
لیکن اب نورِ بصیرت میں نہ قائد نہ عوام
ایسی تہذیب کو ڈنڈوت تمدّن کو سلام
جُرم و عِصیاں ہیں یہاں شرطِ جوانی کے لیے
دوست دیتے ہیں یہاں زخم نشانی کے لیے
سینے ویران ہیں دِل گنگ زبانیں خاموش
دین کا کوئی تحفّظ ہے، نہ ایمان کا جوش

سائنس دیرینہ عقاید کی رُکی جاتی ہے
زندگی موت کے قدموں پہ جُھکی جاتی ہے
سسکیاں اُگتی ہیں مذہب کے عزاخانوں سے
اب حرم آنکھ مِلاتا نہیں تبخانوں سے
درد سب رکھتے ہیں ہمدردی باہم ہی نہیں
زخم ہر دل میں نظر آتے ہیں مرہم ہی نہیں
فاقہ مستوں کی ہے خوراک امیروں کا اُگال
آبدیدہ یہاں نغمے ہیں تبسّم بدحال!
دم بخود شرم سے معبد ہیں جبینیں بے نور
ریزہ ریزہ ہے روایاتِ بزرگاں کا غرور
برف کے بطن میں بیتاب ہے تخریب کی آگ
ہر سفینہ ہے گرجتے ہوئے طوفان کا جھاگ
یُورشِ ابر سے مفلوج ہے سُورج کا نظام
شب کے ہاتھوں میں ہے گستاخ اندھیروں کی لگام
ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے رذالت کا اثر
تھوک کر جاتے ہیں اس خاک پہ خورشید و قمر

باغبانوں کا ہے خونِ گل و لالہ پہ مدار،
فصلیں قلّاش ہوتی جاتی ہیں موسم نادار
رات بے نور بناتی ہے سویروں کو یہاں
چاندنی شمع دکھاتی ہے لٹیروں کو یہاں
ماتمِ سنبل و ریحاں ہے یہاں شغلِ بہار
ہر ابھرتا ہوا سورج ہے شعاعوں کا مزار
اب نہ شاموں کا وہ انداز نہ راتوں کا چلن
صبح کی دھوپ ہے مرحوم مناظر کا کفن!
کوئی منزل نہ جرس را ہگزاروں کی قسم
روشنی حدِّ نظر تک نہیں تاروں کی قسم
اس بھری پیٹھ میں مزدور ہی خوش ہیں نہ کسان
ہیں دفاتر یہاں لٹتے ہوئے کھیتوں کے مچان،
علم اندھا ہے، نظر چور، ارادے محتاج!
قوّتِ دل کی محراب میں سجدوں کا رواج
کیسے کہئے کہ نظامت میں ہیں شیطاں کے مرید
جن کی رگ رگ میں ابھی تک ہے رواں خونِ یزید

ان کا جو شخص ہے اک فرد ہے عیّاری میں
رشوتیں بولتی ہیں مستی و ہشیاری میں !
ان کے اعمال کی فہرست میں تختہ ہے نہ تخت
ہیں یہ تنظیم کی راہوں میں ببولوں کے درخت
ان کے دل سخت ہیں کردار کی نردیں ہیں سیاہ
اِن کے بنگلوں میں بپا رہتا ہے نوروزِ گناہ
کرکے پامال زمینوں کی تمنّاؤں کو
بیچ دیتے ہیں یہ چلتے ہوئے دریاؤں کو !
لوگ سر پیٹتے ہیں فہم کے اندازوں پر
عُرسِ اخلاق ہے حُکّام کے دروازوں پر

(۳)

میرے بدبخت وطن اے مرے گمراہ سماج
گردشِ جام نہیں، گردشِ دوراں کا علاج
سنگریزوں سے کسی نے کہیں کھینچی ہے شراب
نکہتوں نے کہیں تھامی ہے تعفّن کی رکاب ؟

آتشیں ابر سے ساون کی پھواریں کیسی؟
ڈیک اُبھری ہو چمن میں تو بہاریں کیسی؟
چاک دِل خارِ مغیلاں سے بھی سِلتے ہیں کہیں
پھول تلوار کی ٹہنی پہ بھی کھِلتے ہیں کہیں
شعلے کی جیب میں شبنم ہو یہ ممکن ہی نہیں،
کرب نغمات میں مُدغم ہو یہ ممکن ہی نہیں
خدمتِ خلق کے حق میں نہیں ناپختہ علوم
تیرگی نے بھی جنے ہیں کہیں مہتاب و نجوم!

(۴)

کیا کروں شدّتِ جذبات سے مجبور ہوں مَیں
تلخ ہو جاتا ہے لہجہ مرا معذُور ہوں مَیں!
کیوں نہ ہو اب بھی مجھے تجھ سے محبّت ہے دہی
میرے دل میں ترے ناموس کی عظمت ہے وہی
مَیں بہر رخ تری تعمیر کا دیوانہ ہوں!
مَیں ترے بجھتے چراغوں کا بھی پروانہ ہوں

تیرا اک گوشۂ تاریک بھی جنّت ہے مجھے!
والہانہ تری ہر شئے سے محبّت ہے مجھے!
اپنے آنسو ترے پیاسوں کو پلا سکتا ہوں
خون اپنا ترے ذرّوں پہ بہا سکتا ہوں

دیکھتے کیا ہو؟

یہ ساز و برگِ بہاراں ہے دیکھیے کیا ہو
جہاں چمن تھا بیاباں ہے دیکھیے کیا ہو

وہ ہر دیا جو کبھی شمعِ انجمن بنتا!
چراغِ گورِ غریباں ہے دیکھتے کیا ہو

نہ نغمہ ہائے سلاسل نہ نعرہ ہائے جنوں
خموش حلقۂ رنداں ہے دیکھتے کیا ہو!

خدا کے نام سے کد ہے پیمبری سے خلش
یہ آج کل کا مسلماں ہے دیکھتے کیا ہو

نہ کوئی چرخ پہ تارا نہ صبح کے آثار
یہ طولِ شامِ غریباں ہے دیکھتے کیا ہو

ہوا ہے صرف لہو جس کی آبیاری میں
وہ کھیت آج بھی ویراں ہے دیکھئے کیا ہو

عَلم بلند سہی دلنوازیوں کے مگر!

جو آدمی ہے پریشاں ہے دیکھیے کیا ہو؟

بجھے پڑے ہیں جہاں سب پڑوسیوں کے چراغ

اب اس محل میں چراغاں ہے دیکھیے کیا ہو

وفا کو لوگ کہیں لاکھ شرطِ آزادی!

یہ جُرم قابلِ زنداں ہے دیکھیے کیا ہو

بکی ہوئی ہیں بہاریں پڑے ہیں قفس طیور

یہ روئدادِ گلستاں ہے دیکھیے کیا ہو!

نظر نظر کو عقائد شکن اندھیروں میں!

تلاشِ مہرِ درخشاں ہے دیکھیے کیا ہو

محلِّ امن غلط ہے غلط! ابھی باقی!

قصاصِ خونِ شہیداں ہے دیکھیے کیا ہو

جسے دلوں میں لیے پھر رہے ہیں سب دانش

مرے قلم سے نمایاں ہے دیکھیے کیا ہو!

اذانِ سخن

خود آگہی نہ خُدا آگہی کی بات کرو!
یہ میکدہ ہے یہاں بیخودی کی بات کرو

اُگا ہوا ہے ستاروں کی ریت پر مہتاب
قریب ہو کے چلو دلبری کی بات کرو

نئی زمیں ہے نیا آسماں، نیا ماحول
نئے شعور نئی زندگی کی بات کرو!

یہ مقبرے ہیں یہاں ذکرِ زندگی بے سود
کفن فروشی و مرگِ خودی کی بات کرو

خضر کی راہ نہ دیکھو کہ رہنما ہے جنوں!
قدم بڑھائے چلو خود روی کی بات کرو

نئی سحر کے اجالوں کو ہم سمجھتے ہیں
کسی دھوئیں میں گھری روشنی کی بات کرو

ہر اک کو وسعتِ ظرف و نظر نصیب کہاں
بہ احتیاطِ غمِ زندگی کی بات کرو!
نہیں ہے کوئی تعلّق تو گفتگو موقوف!
جو دوستی ہے تو پھر دوستی کی بات کرو
جسے خدائی نے گھبرا کے کہدیا ہے خدا
اسی بلند مقام آدمی کی بات کرو

مرے جنوں کا تو احسان مشورہ یہ ہے
ہزار تلخ سہی مُنصفی کی بات کرو!

لہو کے چراغ

بھڑک اٹھیں کہ جلیں میری انجمن میں چراغ
کسی کی یاد سے روشن ہیں جان و تن میں چراغ

بہت مزار ہیں جن پر دیے نہیں لیکن!
ہیں سوزِ عشق سے روشن کفن کفن میں چراغ

جو پوچھنا ہے پتنگوں سے پوچھ لو ورنہ!
نہ جل سکیں گے یہ تا صبح انجمن میں چراغ

کبھی جو رات ڈھلے چرخ پر نگاہ گئی!
گماں ہوا کہ جلے ہیں مرے وطن میں چراغ

یہ پیش خیمۂ طوفانِ برق و باد نہ ہو
روش روش پہ فروزاں ہیں ہر چمن میں چراغ

مجھے اٹھاتے ہو شاید تمہیں نہیں معلوم
مرے لہو سے جلے ہیں اس انجمن میں چراغ

ملیں گئے ہم سے کہاں تیرہ بخت و خوش خاطر
لیے پھرو گے مزاراتِ علم و فن میں چراغ

جو بجلیوں پہ ہنسے زلزلوں کو ٹھکراتے
وہی جلاتے گا اس شامِ پُرفتن میں چراغ

نہ اتنا خون نہ آنسو دُہائی اے لوگو
پڑے ہیں خشک مرے معبدِ وطن میں چراغ

زبانیں کھنچتی ہیں جن کی ہمیں ہیں یاد رہے!
ہمیں جلاتے ہیں کاشانۂ سخن میں چراغ

نہ شیخ بات بتائے نہ برہمن بولے
رکھا ہے شام سے یزدان و اہرمن میں چراغ

ضمیر و ظرف کو دیکھیں نہ شکل پہچانیں
یہ رکھ دیا ہے کن اندھوں کی انجمن میں چراغ

فسوں گروں کا چراغاں ہے عقل حیراں ہے
کلی کلی پہ اندھیرا چمن چمن میں چراغ

وہ آ گئے ہیں جلاؤ چراغ اے دانشؔ
کہ چار چاند لگاتا ہے بانکپن میں چراغ

"آفاقی دستور"

صدیوں سے جنہیں بھول چکی مجلسِ آفاق
ممکن ہے کہ دوہرائے زمانہ وہی اسباق

لب بند، قلم بند، نظر بند، نفس بند
اس پر بھی ہے ہر شعر مرا خدمتِ آفاق

ہونٹوں پہ ہے ہر وقت مرے روح کی تلخی
گذرے جو گذرتی ہے مری طرزِ نواشاق

واللہ مَیں باطل کا ہوں ہر رخ سے مخالف
حاشا مرے مشرب کا نہیں کفر سے الحاق

رکھتی ہے پریشاں مجھے بے ربطیٔ ملّت
تزویر سے لبریز ہے پہنائیٔ آفاق

کہتے ہیں جسے حُسن ہے اک داغِ تجلّی
دھبّے ہیں دلِ عشق پہ اس دَور کے عُشّاق

مکتب کی فضاؤں میں نہیں نورِ بصیرت
اخلاق کی تعمیر کو درکار ہے اخلاق

الحاد کی زد پر ہیں عقائد کے فضائل!
اِنسان سمجھنے لگا اِنسان کو رزّاق!

تعلیم ہے بے جلوۂ عرفانِ مشیّت!
تہذیب کے ہاتھوں میں نہیں دِین کا چقماق

بندے نہیں خود واقفِ تدبیرِ تجسّس
الزام کہ بے سود ہیں قرآن کے اوراق

گنجائشِ مفہوم نہیں تنگ دلوں میں
رُسوا ہے زمانے میں احادیث کا اعماق

قرآن جو حل کرتا ہے اندازِ تفکّر!
اس رخ پہ نہیں آئی ابھی حکمتِ اشراق

دستورِ حقیقت میں ہے دستورِ محمدؐ!
احسانؔ یہی شہد ہے ہر زہر کا تریاق!

عصرِ حاضر

ان منزلوں میں گردشِ دوراں ہے آج کل
انساں صداقتوں سے گریزاں ہے آج کل
بہروپیوں نے دھار لئے ہادیوں کے رُوپ،
پرچم کشا جماعتِ شیطاں، ہے آج کل
حق کی تلاش ہے نہ حقائق کی جُستجُو،
انسان ظلمتوں میں پریشاں ہے آج کل
قرآں کا احترام نہ پیغمبری کا پاس
اس درجہ مسخ روحِ مسلماں، ہے آج کل
جو فیصلہ ہے عقل کا بے اعتبار د خام
جو مصلحت ہے سر بہ گریباں ہے آج کل
تسکینِ رُوح خام خیالی ہے ان دنوں
دل کا سکون خوابِ گریزاں ہے آج کل

اے کاش باغبانِ حقیقی کوئی اُٹھے
زرخیز خاکِ باغ و بیاباں ہے آج کل
کل جن کا سازباز تھا غارت گروں کے ساتھ
اُن ظالموں میں ذکرِ شہیداں ہے آج کل
اِن تاجرانِ رنگ و نوا کو یہ کیا خبر
اِس باغ میں خزاں کا بھی امکاں ہے آج کل

درس گاہ

یہ درس گاہ، یہ کم عمر زندگی کا دیار
شرافتوں کا شبستاں، شرارتوں کا حصار
یہ صوت و نطق کی بستی، یہ رنگ و بو کا وطن
یہ خال و خد کا نیاباں، یہ چشم و دل کا چمن
یہ کارخانۂ اخلاق و عادت و اطوار!
یہ غور و فکر کا مشرق، یہ معملِ کردار
سیاہیوں میں نئی روشنی کا فوّارہ
جبلّتوں کا محل سیرتوں کا گہوارہ
یہ کونپلوں کا ذخیرہ، بہار کا بچپن،
یہ بول چال کی کھیتی، شعور کا خرمن،
یہ چاند تاروں کا رمنہ، یہ کہکشاں کا حرم،
حیاتِ نو کے نشیب و فراز کا سنگم

یہ عکسِ نور و ضیا رُخ بہ رُخ جبیں بہ جبیں
یہ سیپیوں کا جزیرہ، یہ موتیوں کی زمیں

یہ والدین کا سرمایۂ سُرور و سکوں،
یہ ملک و قوم کا پیمانۂ درون و برون،

بصارتوں میں یہ شوخی بصیرتوں کی نمود
ذہانتوں کی چٹانوں پہ روشنی کا ورود

تخیّلات کی وادی میں صُبح کی تمہید
تصوّرات کے غرفوں سے جھانکتے خورشید

ہوا ہے مجھ کو مرے عرشِ فکر سے الہام
سناؤں جا کے یہ اُٹھتی جوانیوں کو پیام

فضائے صحنِ گلستاں بدلنے والی ہے
یہ دُھوپ سائے کی مرضی پہ ڈھلنے والی ہے

چلے گا اب نہ یہ دھوکے کا کاروبار یہاں
بہت دلیل ہوئی رُوحِ روزگار یہاں

یہاں کلی کوئی موسم پہ کھِل نہیں سکتی،
یہاں غریب کو تعلیم مِل نہیں سکتی

نہ محنتوں کا صلہ ہے نہ دادِ جاں کا ہی
رواں ہے خضر کی نبضوں میں خوں کی گمراہی

سجودِ شوق میں شامل نہیں دلوں کا یقیں،
صنمکدوں کے پجاری ہیں خانقاہ نشیں

ہے اپنی آخری حد پر فروغِ جرم و گناہ
محافظانِ وطن کی ہے عصمتوں پہ نگاہ،

سنو کہ وقت وہ کروٹ بدلنے والا ہے
ہر ایک موج میں طوفاں مچلنے والا ہے

نشیب اُبھر کے بلندی پہ جانے والے ہیں
بلندیوں کے قدم ڈگمگانے والے ہیں

مجھے ہے خوف کہ کر دیں نہ ملک کو بدحال
مخالفوں کے رویّے منافقوں کے خیال،

ہیں رخنہ کار نظامِ حیات میں اکثر
ترقیّوں کے طریقے، قیادتوں کی ڈگر

تم آج پھول ہو کل گلستاں لقب ہوگا
جو آج ذہن میں اُبھرے گا کل وہ سب ہوگا

تمہارے حکم پہ تہذیب باگ موڑے گی!
تھکو گے تم تو ترقّی بھی سانس توڑے گی
سفر کُناں بھی تمہیں راہبر بھی تم ہوگے
دلوں کے زخم بھی تم چارہ گر بھی تم ہوگے
تمہیں یہ بارِ تمدّن سنبھالنا ہوگا
بھنور سے اپنا سفینہ نکالنا ہوگا
مگر سیاست و حکمت سے کام لینا ہے
بڑے بڑوں سے تمہیں انتقام لینا ہے

کاوشِ نظر

وہ جلوۂ جمال شکن دیکھتے رہو
کس اوج پر ہے حسن کا فن دیکھتے رہو

شاید خزاں میں ہو کوئی پہلو بہار کا
اے ساکنانِ صحنِ چمن دیکھتے رہو

ہیں دل شکن شکستِ عقائد کے حادثات
پڑتی ہے کس جبیں پہ شکن دیکھتے رہو

تنظیمِ رنگ و بو سے نہیں مطمئن فضا
ہے بجلیوں کی زد میں چمن دیکھتے رہو

ذہنوں سے اٹھ رہے ہیں حجابات نو بنو
کیا ہو جو اینوں کا چلن دیکھتے رہو

ہر موجۂ شمیم شکستِ بہار ہے
ہر سانس ہے سرورِ شکن دیکھتے رہو

کہدو یہ اُن سے جو نہیں اقدارِ نو کیساتھ
تا عمر دورِ چرخِ کہن دیکھتے رہو

ہر چند ہر مشین ہے سررشتۂ حیات
خود بُن نہ لیں یہ اپنا کفن دیکھتے رہو

دار و رسن مقام ہے مردانِ عشق کا
تم اہتمامِ دار و رسن دیکھتے رہو

جوشِ نمو کرے گا حدودِ چمن شکست
کھلتا ہے کب گلوں کا کفن دیکھتے رہو

روحیں تو اک زمانہ ہوا ہو چکیں فروخت — کس نرخ سے بکیں گے بدن دیکھتے رہو
ممکن ہے اپنی رات کی قسمت سحر بھی ہو — پھوٹے کہاں سے کوئی کرن دیکھتے رہو
کیا ادّعائے خدمتِ مخلوق اسی پہ ہے — بشرے پہ ہر بشر کے تھکن دیکھتے رہو
دامانِ باغباں ہیں گھٹاؤں کے سائے میں — جلتا ہے کس طرح یہ چمن دیکھتے رہو
لُو دے اٹھے نہ جوشِ بہاراں سے یہ چمن — جلنے لگیں یہ سرو و سمن دیکھتے رہو
ہر چند انقلاب کے آثار ہیں تمام! — بدلے یہ کب نظامِ چمن دیکھتے رہو
لے گی نہ وقت رہبر و رہزن کی گفتگو — ہوتا ہے کیا بہ چشم زدن دیکھتے رہو
پھُوٹیں گے کونپلوں سے تقاضے حیات کے — اے صاحبانِ نظمِ چمن دیکھتے رہو

احساؔن کے کلام کو وہ سُن چکے مگر
اب کس طرف ہو روئے سخن دیکھتے رہو

نقشِ عمل

غم اپنا زمانے سے بیاں ہم نے کیا ہے
سامانِ سکونِ دل و جاں ہم نے کیا ہے
اقدارِ تمدّن کو بدلتے ہیں ہمیں لوگ
تعزیر کو عظمت کا نشاں ہم نے کیا ہے
شاہد ہے خدا اس کا، ہمیں خود بھی ہے احساس
درمانِ غمِ ہر دو جہاں ہم نے کیا ہے
ہر شخص کو جو خود کو خدا جان رہا تھا
آگاہِ خدائے دو جہاں ہم نے کیا ہے
یہ مصلحتِ وقت کا ایما تھا کہ اکثر
ذکرِ قفس و برقِ تپاں ہم نے کیا ہے
دیوانوں کے نزدیک ہیں سب دشت و چمن ایک
معزولِ غمِ سود و زیاں ہم نے کیا ہے

اب دے نہ سکے گا کوئی موسم ہمیں دھوکا
شعلوں پہ بہاروں کا گماں ہم نے کیا ہے

جس راہ میں تھے خارِ مغیلاں کے بچھونے
جلووں میں اُسے کاہکشاں ہم نے کیا ہے

روکی نہ گئیں طوق و سلاسل سے زبانیں
جو دل میں ہوا ہے وہ بیاں ہم نے کیا ہے

جو راز تھا انسان و خداوند میں حائل!
وہ راز زمانے پہ عیاں ہم نے کیا ہے

ہم جور و ستم میں بھی رہے شاد و غزلخواں
کم دبدبۂ کج کلہاں ہم نے کیا ہے

اصنام پرستی کوئی تقدیر نہیں تھی
ہاں ہم نے کیا عشقِ بتاں ہم نے کیا ہے!

جس نورِ مقدس کو ترستی تھیں نگاہیں
محسوس قریبِ رگِ جاں ہم نے کیا ہے

میدانِ بلا بھی ہے شہادت کا محل بھی!
اس حال کو ماضی کا سماں ہم نے کیا ہے

اب تخت پہ یا دار کے تختے پہ رکیں گے
وہ مجمعِ آشفتہ سراں ہم نے کیا ہے
جس جرمِ جنوں سے ہیں خرد مند گلو گیر
ہم کھل کے یہ کہتے ہیں کہ ہاں ہم نے کیا ہے
زنداں کی طرف آئے ہیں ہنس ہنس کے وفاکوش
یہ قافلۂ شوق رواں ہم نے کیا ہے
شبنم گل و لالہ پہ نہیں خون کی بوندیں!
یوں تذکرۂ جورِ خزاں ہم نے کیا ہے
ہر زنگیٔ دوراں کو بہر شکل و بہر طور
آئینے کی جانب نگراں ہم نے کیا ہے
سینوں میں بصیرت کے اجالوں کو جگا کر
شورِ غمِ دوراں کو اذاں ہم نے کیا ہے
کعبہ ہو کہ بتخانہ ہیں سب گوش بر آواز
ایجاد وہ اندازِ فغاں ہم نے کیا ہے!
ممکن ہے کہ ہو راہزنوں کا بھی جگر چاک
اب تک تو غمِ راہرواں ہم نے کیا ہے

ذرّوں کے دریچوں سے نظر آتے ہیں خورشید
یہ رنگِ جہانِ گزراں ہم نے کیا ہے،
پھولوں کی طرح نرم بھی رنگیں بھی حسیں بھی
پندارِ دلِ کج نگہاں ہم نے کیا ہے
ممکن ہے کہ ہر سانس میں شعلوں کی لپک ہو
وہ خونِ رگِ ہستی میں رواں ہم نے کیا ہے
ہونٹ اب بھی سیئے جاتے ہیں حق بات پر اکثر
ہر چند یہ سودا ہے گراں، ہم نے کیا ہے
تاریخِ گلستاں میں جو کچھ ہیں تو ہمیں ہیں
شبنم کو میساں شعلہ فشاں ہم نے کیا ہے
رندوں کا کرشمہ ہو کہ نیّت کا صلہ ہو،
واعظ تھا! جسے پیرِ مغاں ہم نے کیا ہے
گھٹتی ہے اگر سانس روایات کی گھٹ جائے
دل اپنا جلاتے ہیں، دھواں ہم نے کیا ہے!
ہنگامۂ زنداں ہو کہ شورِ رسن و دار
اب تک وہیں برپا ہے جہاں ہم نے کیا ہے
تہذیب پہ احسان ہمارا ہے ہمارا،
خودداریٔ انساں کو جواں ہم نے کیا ہے

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

لائل پور کے شہید مزدوروں کی روحوں کو

خراجِ عقیدت

باخبر میں بھی ہوں اس سے ہے مجھے بھی یہ شعور!
مان چسٹر ہے زمینِ پاک کا لائیل پور
اس لیے ہر کوچے میں ہے سرمایہ داروں ہی کا راج
جن کی شخصیّت کے بننے سے بگڑتا ہے سماج
اے مرے مزدور طبقے اے مرے نادار دل!
کب سے یہ دنیا نہیں دیتی تمہیں محنت کا پھل!
تم مگر واقف نہیں اب تک ہوائے دہر سے
آئے دن بس مرتے رہتے ہو خود اپنے زہر سے
تم میں وہ پہلا سا اِستحکامِ اخلاقی نہیں!
تم میں اب اوصافِ عالی کی رمق باقی نہیں!

چین لینے ہی نہیں دیتا تمہیں ناقصِ جنوں
ہے تمہاری بستیوں میں زندگی زار و زبوں
علم کی تم کو طلب ہے اور نہ فن کی آرزو !!
چاٹتے رہتے ہو تم دن رات اپنا ہی لہو
یہ خبر تم کو نہیں اے خادمانِ روزگار
اصل میں دو قوم ہیں مزدور اور سرمایہ دار!
ان کا مشرب ہے جدا ان کی جدا ہے زندگی
اک طرف تاریکیاں ہیں اک طرف تابندگی
اک طرف محرومیاں ہیں اک طرف میخواریاں
اک طرف ظالم تعیّش، اک طرف ناچاریاں
اک طرف عشرت کے نغمے اک طرف آہ و فغاں!
اک سہانی چاندنی ہے اک چتاؤں کا دھواں
اک طرف طاعت گزاری، اک طرف جرم و گناہ
اک طرف صبحِ تجلّی، اک طرف روزِ سیاہ
اک طرف زنجیرِ دوراں سے قدم جکڑے ہوئے
اک طرف شیطاں کا دامن آدمی پکڑے ہوئے

مُنعموں کی اپنے مقصد سے نہیں ہٹتی نگاہ!
دوستی ہے جُرم ان کی اعتماد ان کا گناہ!
اہلِ دولت صاحبِ ایمان ہو سکتے نہیں
یہ درندے ہیں کبھی انسان ہو سکتے نہیں

تم ابھی واقف نہیں اس ناخلف قانون سے
ان کے چہرے رنگ پیتے ہیں تمھارے خون سے
پرورش میں منہمک ہو جن کی تم دیوانہ وار!
مفلس آزاری ہے ان فربہ درندوں کا شعار
ہے تمہارا منتظر مدّت سے فطرت کا شباب:
تم اگر پہچان لو خود کو تو یہ ہے انقلاب!

تم جو کر لو اپنی پنہاں قوّتوں کو آشکار
سامنے وہ دن ہے نکلو گے ستاروں پر سوار
سب تمہاری قوّتیں ہیں صرصر و برق و سحاب
تم کو کرتی ہے مخاطب ہر پیمبر کی کتاب!

بزمِ آب و گِل میں تزئین و حرارت تم سے ہے
دیدۂ ہستی میں تنویر و بصارت تم سے ہے!

تم سے چلتی ہیں مشینیں، تم سے کھِلتے ہیں چمن
تم سے قائم ہے عروسِ زندگی کا بانکپن!
ہیں پھٹے کپڑے تمہارے فتح و نصرت کے علم
اور ہتھیلی پر تمہاری ہے بلندی کے قدم
ان کمینوں کے اشاروں پر چلو گے تا بکے؟
چپکے چپکے اپنے دوزخ میں جلو گے تا بہ کے؟
تم اسے سمجھو نہ سمجھو جانتی ہے کائنات
تم سے ہے ان احدیوں کا سازوسامانِ حیات!
ہے تمہاری خستہ حالی پر اساسِ گلستاں
وہ اساسِ گلستاں جس سے ہے پھولوں کا زیاں
تم اگر مل کر بچالو اپنے اشکوں کے دیئے!
لازم آجاتا ہے رونا ہنسنے والوں کے لیے!
ذوقِ منزل کھو کے دامِ راہبر میں آگئے
تم حصاروں سے نکل کر رہگزر میں آگئے
زندگی لازم ہے حق کے پاسداروں کی طرح
نکلو غنچوں کی طرح ڈو بوستاروں کی طرح

اے مرے مقتول مزدوروں کی روحو السّلام
تم نے قربانی سے پایا ہے شہادت کا مقام
وقت جب کر لے گا اس دورِ جہالت کو عبور
یہ تمہارا خونِ ناحق رنگ لائے گا ضرور
کِس قدر گمراہ دل ہیں کِس قدر ناقِص دماغ
جو یہ کہتے ہیں جلیں گے خونِ انساں سے چراغ
یہ شقاوت کیا فضائے امن میں ڈھل جائے گی!
خونِ انسانی سے کیا انڈسٹری چل جائے گی؟
آگ میں کس طرح کِھل جائیں گے بے موسم کے پھول
بادہ پکائے گی کیسے جھوم کر شاخِ ببول؟
کیسے پڑ سکتا ہے یوں قانونِ فطرت میں خلل؟
کیسے بن جائیں گے مزدوروں کے لاشوں پر محل؟
باغبانی کے لیے گلچیں کی تائیدیں غلط
گولیاں چلنے سے مِل چلنے کی امّیدیں غلط

زندگی کے مختلف نظریے

مختلف انداز سے آئی ہے تعریفِ حیات
کوئی کہتا ہے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
کوئی کہتا ہے محبت بھی عجب شئے ہے مگر
زندگی دولت ہے دَولت کے سوا کچھ بھی نہیں
کوئی اس کا بھی ہے قائل لیکن اس کے ساتھ ساتھ
یہ بھی کہتا ہے تجارت کے سوا کچھ بھی نہیں
کوئی کہتا ہے تجارت تو ہے رُوحِ زندگی،
جسم، تقسیم و حکومت کے سوا کچھ بھی نہیں
لیکن اب احسان میں کہتا ہوں یہ سب کچھ غلط
زندگی جہد و سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

کچھ خبر بھی ہے اے غافلو، بے حسو، الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل!
اس علاقے میں ہر گام پر زندگی ہو گئی موت سے بھی سوا آجکل
پتّی پتّی ہے گلشن کی بکھری ہوئی سسکیاں لے رہی ہے صبا آجکل
کل جہاں لاکھ فانوس صنوبر یہ تھے کوئی جلتا نہیں ہے دیا آجکل
قابلِ قتل ہے لائقِ دار ہے اس خرابے کا ہر بے خطا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

وُہ فرانس آج تک بھی جو مشہور ہے، مولیر، سارتر، موپساں کا وطن
اہلِ احساس، اہلِ نظر، اہلِ فن، یعنی زولا کا اور ایراگاں کا وطن
پرورش جس جگہ پا گئی گبریل نے، مدتوں جو رہا گارساں کا وطن!
اس سے اٹھے ہیں رُوسو بھی، یہ سرزمیں رہ چکی ہے کبھی آسماں کا وطن
لیکن اُف بندگانِ شیاطیں یہاں کھو چکے دل سے خوفِ خدا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

ہیں فرانسیسیوں ہیں مسلّح سبھی اور نہتّے جزائر مقابل میں ہیں!
جو نفس ہیں خدا کی عبادت میں ہیں جو قدم ہیں شریعت کی منزل میں ہیں
زخم ماتھوں پہ، چہروں پہ بہتا لہو، ولولے پھر شہادت کے ہر دل میں ہیں
ان کے ایقان کی کھیتیاں سبز ہیں، جنّتیں مطلب ان کے حاصل میں ہیں
عرشِ اعظم پہ مصروفِ فریاد ہے غم کے ماروں کی آہ و بکا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

اک طرف ساز و ساماں ہیں سب جنگ کے اک طرف خستہ و زار فنادار ہیں
اک طرف ہے سواروں کا سفاک دل، اک طرف لاٹھیاں جن کے ہتھیار ہیں
اک طرف ٹینک، بم، توپ، ریوالور، اک طرف دست و بازو مددگار ہیں
اک طرف آگ، بارود، اسٹین گن، اک طرف بھوکے پیاسے رضاکار ہیں
گندھک اور گوشت کی بُو سے لبریز ہے الجزائر کی ساری فضا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

وہ جمیلہ کہ ہے پیکرِ صد وفا، جس کو چاہے خدا قلبِ بیدار دے
جسمِ نازک پہ دشمن نے چھکے دئے تاکہ یہ شیرنی کچھ تو سنبھار دے
لیکن اس کے عزائم تو ہیں آہنی یہ تصوّر بھی آئے تو للکار دے
آئے تاریخ اور اپنی فہرست سے کم سے کم ایک تمثیلِ ایثار دے
بے شہادت ہی یہ دشمنِ آشتی موت کی دے رہے ہیں سزا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

ان کو ہے کیا خبر یہ غلط فیصلہ آج صدیوں کے پندار کی موت ہے
جس جگہ قتلِ قانون ٹھہرے روا اُس میں پہلے تو سرکار کی موت ہے
یہ جمیلہ یہ اس درجہ ظلم و ستم، صاف احساس و افکار کی موت ہے
بے خطاؤں کو تجویزِ دار و رسن، طوق و زنداں کی اور دار کی موت ہے
کوچہ کوچہ کی خاموشیوں میں رواں زخمیوں کی ہے آہ و بکا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

یوسف اور اس کے ہمراہیوں کے مکاں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں عدو ہر طرف

بام و در پر خود اپنی شہادت کو ہے بے گناہوں کا زندہ لہو ہر طرف

ٹھوکروں میں ہیں مقتول بچّوں کے سر، خوار ہے ماؤں کی آبرو ہر طرف

کوچوں گلیوں کے آغوش میں عام ہے خون اور پیپ کی تیز بو ہر طرف

سن کے جلاد بھی کانپ جائیں جنہیں، ظلم ہوتے ہیں وہ برملا آجکل

الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

ان میں یٰسین کا تب کے ہر نقطہ سے زندگی کے اشارات بیدار ہیں

نالہائے ہدیٰ سے جہاں دیکھئے عسکرانہ روایات بیدار ہیں

علم و اخلاق سب خاک میں مل گئے گرچہ ارض و سماوات بیدار ہیں

نعرۂ حرّیت بلنیڈ نے کھا لیا فوجیوں کے خرافات بیدار ہیں

تھے جہاں لالہ و گُل کے تختے وہاں اک قیامت ہے ہر سُو بپا آجکل

الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

عقل نے جب بگڑ کر نہ مانا کہا ارتکابِ جنوں جا بجا نہ کیا
بات جو کی وہ اخلاق سے دُور کی، کام جو کچھ کیا ظالمانہ کیا!
ہسپتالوں کو مذبح بنایا گیا، زخمیوں پر عمل قاتلانہ کیا
باندھ کر شیر خواروں کو پھینکا گیا پھینک کر گولیوں کا نشانہ کیا

چرخ سے ہے نزولِ بلا ہر طرف چل رہی ہے مخالف ہوا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

کون ہوگا جو اس ظلم کو دیکھ کر ظالموں کے لئے مرحبا کہہ سکے
کون سا ہوگا آخر وہ پتھر کا دل ان مناظر سے جو بے اثر رہ سکے
کون سی آنکھ ہوگی وہ جس آنکھ سے گرم ہو کر نہ دل کا لہو بہہ سکے
آدمی اس قدر ظلم رکھے روا وقت آنے پہ خود بھی جسے سہہ سکے

لیکن ان کے عقیدوں سے ہے دُور تر پاس آئینِ مہر و وفا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

رہ گئی دب کے چیخوں کے انبار میں مسجدوں کی دلوں سے گزرتی اذاں
ہر دکاں پہ دکاں دار کی لاش ہے ہر مکاں میں مکینوں کی ہیں ہڈّیاں!
کر رہا ہے سحر کو بھی شامِ الم، گرم بارود کا پیچ کھاتا دھواں
یہ تشدد یہ سیلابِ جبر و ستم الاماں الاماں الاماں الاماں

جیسے بستی میں طاعون زوروں پہ ہو، دم بخود ہے ہر اک راستا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

اس سے جو مطمئن بھی ہیں خاموش بھی میرا اُن کے لئے ایک اعلان ہے
کل کو ان کے لئے بھی اسی دور میں اس سے بڑھ کر تباہی کا امکان ہے
اپنے ماحول کا بھی تو لیں جائزہ کتنا تیار پہلے سے میدان ہے!
نام کو بھی کہیں سے اگر چھڑ گئی پھر نہ ہم تم نہ یہ ساز و سامان ہے

روحِ ارض و سما سخت بے چین ہے کروٹیں لے رہی ہے فضا آجکل
الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

جو ذخیرے تھے غلّے کے لُوٹے گئے کھیتیاں نیم پختہ اجاڑی گئیں
دہلی دہلی پہ حلقوم کاٹے گئے سُولیاں شاہراہوں پہ گاڑی گئیں
پارساؤں کے چہروں پہ تھوکا گیا ڈاڑھیاں عالموں کی اکھاڑی گئیں
بھائی بہنوں کے جوڑے ملائے گئے مائیں بیٹوں کے آگے پچھاڑی گئیں
رقصِ عریاں خواتین کے ہیں یہاں پیشِ اربابِ جور و جفا آجکل
کچھ خبر بھی ہے اے غافلو! بے حسو! الجزائر کا عالم ہے کیا آجکل

آثارؔ

(عراق کی آزادی پر عوام کے رُجحانات سے متاثّر ہو کر)

منزل پہ رَوشنی کا کچھ امکاں ہوا تو ہے
گردوں پہ نورِ صبح نُمایاں ہوا تو ہے
ہر سانس موجِ برق و شرر ہو تو کام ہو!
اِک ولولہ دِلوں میں پر افشاں ہوا تو ہے!
زعمِ حیات و عدل میں اک من چلوں کا غول
فطرت کی عظمتوں کا نگہباں ہوا تو ہے!
صد شکر ایک لشکرِ خوددار و خود نگر!
شاہنشہی سے دست و گریباں ہوا تو ہے
ہے احتسابِ نو سے دماغوں میں کشمکش!
دشوار تھا جو کام وہ آساں ہوا تو ہے

ٹوٹیں گے جانے کتنے اندھیروں کے سلسلے
دریافت ایک چشمۂ حیواں ہوا تو ہے!

یہ حرکت و حیات کہاں تک ہو کارساز
جُنباں جمودِ خونِ مسلماں ہوا تو ہے

پامال خاکِ چرخ سے حق مانگنے لگی!
قرآں مُصر بہ معنیِ قرآں ہوا تو ہے

اُتریں گے جانے کتنے درندے قضا کے گھاٹ
انساں شناس کچھ دلِ انساں ہوا تو ہے

گردُوں پہ ایک ابرِ شفق گوں کے سائے میں
دل کو یقینِ عظمتِ یزداں ہوا تو ہے

ہر ذرّۂ زمینِ گلستاں بہ طرزِ خاص
اصلاح خواہِ جورِ بہاراں ہوا تو ہے

اب ہے ہوا کی بات موافق ہو یا خلاف
ساحِل پہ شورِ خطرۂ طوفاں ہوا تو ہے

ٹھٹھری ہوئی حیات کے قالب کو توڑ کر
اک شعلۂ شعور فروزاں ہوا تو ہے

یہ مُعجزہ ہے یا کوئی تنظیمِ مستقل ؟
آتشکدہ میں کارِ گلستاں ہوا تو ہے

رستوں میں چوکیاں نہ بٹھادیں کفن فروش
ذوقِ حیات دھر میں ارزاں ہوا تو ہے

یہ روشنی یہاں بھی جو پہنچے تو لطف ہو
تاریکیوں میں دُور چراغاں ہوا تو ہے !

سہرا ہے

تمام نظمِ گلستاں ہے مستعار ابھی
کہ نادرست ہے تخمینۂ بہار ابھی

تونگری ہیں ہیں بہروپ بے شمار ابھی
عوام آئینگے دھوکے میں بار بار ابھی

بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ہنگامے
خمار میں ہیں اراکینِ اقتدار ابھی

ابھی ہیں مذہبِ فطرت پہ سینکڑوں پردے
خلافِ شرع ہے قانونِ شہریار ابھی

کسے خبر ہے کہ کل کون سی ہوا چل جائے
کہ خاک و خوں میں ہے لتھڑی ہوئی بہار ابھی

جگہ جگہ ہیں جوانوں کے خون کی جھیلیں،
جگہ جگہ ہے شہیدوں کی یادگار ابھی

ملا اُنہیں جو سزاوارِ یک نگاہ نہ تھے
اُمیدوارِ کرم ہیں اُمیدوار ابھی
ہے ایک صُبحِ گلستان و شامِ ویرانہ
خزاں کے ڈر سے ہے سہمی ہوئی بہار ابھی
نہیں کسی کو بھی انجامِ کارواں کی خبر،
کہ اُڑ رہا ہے اُفق تا اُفق غبار ابھی
ابھی سکون میسّر کہاں رعایا کو،
ہیں نقص طرزِ حکومت میں بے شمار ابھی
اُٹھا نہ دیں کہیں نافہم ناخُدا لنگر
ہوا نہیں ہے سمندر کی سازگار ابھی
نہیں ہے کس لئے امروز مطمئن آخر!
اگر نہیں کسی فردا کا انتظار ابھی؟
رَواں ہیں قافلے والے قیاس کے بل پر
وجودِ خضر سے خالی ہے رہگزار ابھی
ابھی ہیں سینکڑوں ظرف و ضمیر کے تاجر
چلے گا خام سیاست کا کاروبار ابھی،

لہو بہا تو نکھر آئیں پتّیاں، لیکن،
بلندیوں پہ ہے چھایا ہوا غبار ابھی
میں کیا مطالبۂ رنگ و بُو کروں دانشؔ
چمن کو خود ہی میسّر نہیں بہار ابھی!

ایک ہُوک

دستور ساز اسمبلی کے پہلو میں جھونپڑے دیکھ کر

ہر رہ پامال تنکر کہکشاں بنتی ہوئی
ہر زمیں کروٹ بدل کر آسماں بنتی ہوئی
رقص کرتے رنگ، اڑتی نکہتیں، ہنستے ایاغ،
شادماں رستے، سکوں پرور محل، گاتے چراغ
شادیانے، ارغنوں، طاؤس، طنبورے، ستار
وقت کے ہونٹوں سے جاری زمزموں کے آبشار
فتح کے سرسبز پرچم، صلح کے سیمیں نشاں
ایک سمجھوتہ گناہ و اتقا کے درمیاں
ظلمتوں کے بارجوں سے آفتابوں کی نمود،
بولتی خاموشیاں پر تولتے بوڑھے جمود

نوجواں ساتنس کے چہرے پہ آثارِ بہار
جس کے آگے سرنگوں لاکھوں عقائد کے منار
رقص میں تہذیب کی دیوی بصد انداز و ناز
پوپلے ماضی کی ناراضی سے بالکل بے نیاز
مہرِ پُر اسرار، حکّامِ نوی کے ہاتھ میں
آدمی کی باگ گویا آدمی کے ہاتھ میں
لیکن اب بھی دفترِ آئین سازاں کے قریب
رات کو فاقوں سے سو جاتے ہیں دُکھیارے غریب
جن کے ہونٹوں پر خموشی جم گئی چہروں پہ یاس
ٹاٹ کے ٹکڑے ہیں جن کی ماؤں بہنوں کے لباس
دَورِ ناؤ نوش میں بھی جن کے خالی ہیں سبُو
مُلک کی بُنیاد میں ہے جن کی شہرگ کا لہُو
جن کی صُبحوں پر بھی منڈلاتے ہیں سائے شام کے
جن کے حق کھا کھا کے چہرے سُرخ ہیں حکّام کے
جن کی ناداری سے آبِ رنگ زرداروں میں ہے
بادشاہی جن فقیروں کے نمک خواروں میں ہے

حاکموں کو آہ اُن ماؤں کے دل کی کیا خبر!
جن کے بچّے ضد نہیں کرتے کھلونے دیکھ کر
جن کی گنجائش ابھی شخصی سیاست میں نہیں
جن کے حصّے کا سکوں ظرفِ حکومت میں نہیں
خوُن سے جن کے نئے گلشن اُگائے جائیں گے
جن کے بچّے جنگ کا ایندھن بنائے جائیں گے
جینے کو جیتے ہیں لیکن زندگی پامال ہے
مرنے والوں کے لئے گور و کفن کا کال ہے
شور برپا ہے نیا دستور ڈھالا جائے گا
ظلمتوں کو گوُندھ کر سوُرج نکالا جائے گا
کیا اسے تسلیم کر سکتا ہے کوئی آدمی؛
موت بیماروں کو دے سکتی ہے درسِ زندگی؛
غفلتیں کس طرح رکھ سکتی ہیں بیداری کی لاج
اہرمن کے ذہن سے باہر ہے یزداں کا مزاج
مقبرے کیا کر سکیں گے مجلسوں کا اہتمام؟
تندرستی کیا کسی سائل کو بخشے گا، جذام؛

بندوں کو کیا خبر کیا شے ہے میدانِ مصاف؟
زہر کب امرت بنا ہے اپنی فطرت کے خلاف؟
آگ کے تودوں پہ کب اگنے لگے خوش رنگ پھول؟
تیرگی کب وضع کر سکتی ہے جلووں کے اصول؟
ظلم کے دامن سے نورِ منصفی چھنتا نہیں؛
ابرِ نیساں کارخانوں کا دھواں بنتا نہیں!!
بزمِ ماتم میں تبسّم کا نہیں اٹھتا سوال!
خنجروں سے کیوں کوئی رکھے امیدِ اندمال؟
پیروِ ابلیس ہرگز آدمی بنتا نہیں!
تیرگی کا بھتان دھل کر چاندنی بنتا نہیں!
بے ضمیروں میں شعورِ خسروی ممکن نہیں
یہ درندے اور انساں دوستی ممکن نہیں
کاش ارکانِ حکومت سے کرے کوئی سوال
کجروی کیسی ہے یہ اے بندگانِ ذوالجلال،
کیا تمہارے ہی لئے ہیں دو جہاں کی نعمتیں؟
دو جہاں یعنی زمین و آسماں کی نعمتیں،

محنتیں لے کر صلہ دیتے ہو کمظرفی کے ساتھ
ہاتھ دنیا ہے کوئی تم کو تو کھا جاتے ہو ہاتھ
کیا یہ منشا ہے تمہارے مشرب و دستور کا
شام تک تم چوس کر چھوڑو لہو مزدور کا
کیا روا ہے مذہبی رُو سے تمہارا یہ شعار
تم تو بھر لو توند اور فاقے سے سوئے کاشتکار
کیوں ہم آخر علم کے میداں میں بڑھ سکتے نہیں
کیوں ہمارے لختِ دل کالج میں پڑھ سکتے نہیں
ہم تمہارے قصر و ایواں پر کریں جانیں نثار
تم ہمارے جھونپڑے دیکھو تو گزرے ناگوار
سوچ لو اب بھی کہ اب بھی وقت ہے ترمیم کا
ہم کو شکوہ ہے تمہاری ناروا تقسیم کا
اب ہمیں تجدیدِ ماضی کی اجازت چاہیئے
عدل جو چاہے وہ دستورِ ریاست چاہیئے
ناز ہے تم کو جو طاقت پر تو ہم بھی کم نہیں
فیصلہ دو ٹوک ہے، یا تم نہیں، یا ہم نہیں

تقسیمِ مُلک کے بعد انتقالِ آبادی کے سلسلے میں

جوابی اِقدام

زمیں پہ فصلِ گل، فلک پہ کہکشاں کو لوٹ لو
تمہاری زد پہ این و آں ہیں، این و آں کو لوٹ لو
یہ وقت ہے اٹھو، مکان و لامکاں کو لُوٹ لو
خدا یہ کہہ رہا ہے خود کہ دو جہاں کو لوٹ لو

شراب و نغمہ و جمال، رُوحِ زندگی نہیں!
یہ زیبِ داستاں ہیں زیبِ داستاں کو لوٹ لو
روا ہو جس درندگی میں عصمتوں کی لوٹ بھی
بپھر کے اس درندگی کے نیستاں کو لوٹ لو
ضعیفوں کے آنسوؤں پہ جو نہ رحم کر سکے
وہ ناخلف ہے ایسی نسلِ نوجواں کو لوٹ لو

جہاں ہو کمسنوں کا خون حاکموں کے حکم سے!
وہاں یہ حکم ہے وقارِ حکمراں کو لوٹ لو

شکستہ پر وہ زمزمہ بیک زباں الاپ دیں
جو باغ خود پکار اٹھے کہ باغباں کو لوٹ لو

جنوں کا مشورہ یہ ہے اگر غلط قدم اٹھے
تو کارواں کے ساتھ میرِ کارواں کو لوٹ لو

عجب نہیں کہ ٹوک دے ہجومِ رنگ و بو تمہیں
سحر سے پہلے پہلے بزمِ گلستاں کو لوٹ لو

نصیب سے جبیں، رہینِ حسنِ ماسوا نہیں،
سجودِ شوق سے کہو کہ آستاں کو لوٹ لو

زمیں کے خاص سیم و زر، فلک کی خاص نعمتیں!
ہیں منتظر چلو، زمین و آسماں کو لوٹ لو

جہادِ زندگی میں خوابِ رہرواں حرام ہے
جو سو رہا ہو کارواں تو کارواں کو لوٹ لو

جہاں کے پاسبانِ قوم، تاجرانِ قوم ہوں،
بڑھو اور ایسے تاجروں کی ہر دکاں کو لوٹ لو

خزاں میں جو نہ گا سکیں، جو اَوج پر نہ اُڑ سکیں
چمن میں ایسے طائروں کے آشیاں کو لُوٹ لو

یہ کانپتی بلندیاں ہیں انقلاب کی قسم
علَم علَم کو خم کرو نشاں نشاں کو لُوٹ لو

اجارہ دارِ امن ہیں، اجارہ دارِ کشت و خوں
یہ راہزن ہیں اس گروہِ رہزناں کو لوٹ لو

اگر چمن سیاستِ چمن سے باخبر نہیں
شریعتِ بہار ہے کہ باغباں کو لوٹ لو!

سنو کہ کہہ رہا ہے کیا سیاہیوں کا سلسلہ
بُجھا کے شمعِ مہر و ماہ آسماں کو لوٹ لو!

تمہارا مقصدِ نظر تمہارا حاصلِ جنوں!
جو حکمراں کے پاس ہو تو حکمراں کو لوٹ لو

دعوت نامہ

اے حسنؔ یحییٰ! مبارک ہو تجھے شادی مگر
مجھ کو عصرانہ میں مُبوا کر نہ دل رنجور کر!
تُو نے دعوت نامے بھجوائے ہیں جن لوگوں کے نام
تیری نظروں میں ہے جن جن ہستیوں کا احترام
کون سا مفلس ہے ان میں کون سا مسکین ہے
یہ ترے گھر پہ نہ آئیں گے تو کیا توہین ہے؟
دم گھٹا جاتا ہے ظالم! مستقل اک ضیق ہے
ہم تو اپنے گھر بھی کھا لیتے ہیں جو توفیق ہے
اُن کو دعوت دے جنہیں ملتا نہیں غم سے فراغ
جن کی شاموں کو میسّر آ نہیں سکتے چراغ
اُن کو دعوت دے جو بیچارے ہیں فاقوں سے نڈھال
جن کی نبضوں میں نہیں اٹھتا حرارت کا سوال

اُن کو دعوت دے کبھی جو شادماں ہوتے نہیں
جن کے بچّے سُوکھ جاتے ہیں جواں ہوتے نہیں
ان کو دعوت دے تمدّن جن پہ ڈھاتا ہے ستم
جن کا مہمانوں کی صورت دیکھ کر رکتا ہے دم
اُن کو دعوت دے جو ہیں خاموش بھی، مغموم بھی،
بھول بیٹھے ہیں جو اطمینان کا مفہوم بھی
شادمانوں میں جو بانٹی شادمانی کیا ہوا؟
اَبر نے دریا پہ برسایا جو پانی کیا ہوا؟
پھول گلشن میں بہاروں نے جو برسائے تو کیا؟
بے ضرورت شام کو بڑھنے لگے سائے تو کیا؟
کوہساروں میں ہوائے سرد چلتی ہے تو کیا؟
گھر کلالوں کے شرابِ ناب ڈھلتی ہے تو کیا؟
قوّتوں نے قوّتوں کی دستگیری کی تو کیا؟
اپنے حلقے میں امیروں نے امیری کی تو کیا؟
اہلِ زر سے اہلِ زر کا سازہے، ہوتا رہے!!
ناز کے پالوں میں شغلِ نازہے، ہوتا رہے!!

میں تو اُس مذہب کا قائل ہوں نہ اُس ایمان کا
جس میں عنصر ہو نہ غالب خدمتِ انسان کا

ماہ و انجم ہیں زمیں کو جگمگانے کے لئے
رفعتیں ہیں پستیوں کا دل بڑھانے کے لئے

یہ لوگ

یہ بات اگرچہ سرِ انجمن نہیں کرتے
یہ لوگ عزّتِ قوم و وطن نہیں کرتے

شرابِ و شاہد و نغمہ ہے بام بام یہاں
مہک کے تذکرۂ علم و فن نہیں کرتے

شکستِ ضبط پہ دیتے ہیں مفلسوں کو سزا
خود احترامِ اصولِ چمن نہیں کرتے

لباس و شکل کا رشتہ یہاں دلوں سے نہیں
یہ خلوتوں کو کبھی انجمن نہیں کرتے

گلی گلی میں ہیں آذر، قدم قدم پہ صنم
مذمّتِ روشِ برہمن نہیں کرتے

رواجِ عام ہے قلموں کا لالہ و گل میں
یہاں حفاظتِ نسلِ چمن نہیں کرتے

نقوش و رنگ کی قیمت کا کیا سوال اُٹھے
یہ رُوح بیچ کے رنج و محن نہیں کرتے

چمن میں رہ کے چمن کو قفس بنا دیں گے
قفس میں جا کے قفس کو چمن نہیں کرتے

نہ خامکاریِ سجدہ، نہ گمرہیِ زکاتؔ
یہ ہوشمند ہیں، دیوانہ پن نہیں کرتے!!

جدید دور کے طرزِ حیات میں ناکام
اور اعتمادِ نظامِ کہن انہیں کرتے

یہاں جو راہنماؤں کی شہ پہ ہو گزرا
وہ ساز باز کہیں راہزن نہیں کرتے

انہیں بہار فروشی کا پڑ گیا لپکا،
یہ آبیاریِ سرو و سمن نہیں کرتے

شکایتِ نگہِ برق و باد ہے از بر
مگر درست نظامِ چمن نہیں کرتے

یہ طاقتوں کے پرستار، سیم و زر کے غلام
قبول دعوتِ دار و رسن نہیں کرتے

ہوس سے ان کے تعیّش میں رخنہ اندازی
یہ اختیار کبھی وہ چلن نہیں کرتے
اَڑے ہیں اس پہ، جنوں کو نہ ہوشیار کرو
کہ پھول چاک ابھی پیرہن نہیں کرتے
روا ہے ان کے لیے خونِ مخلصانِ وطن،
اور اس پہ زحمتِ گورو کفن نہیں کرتے
نژادِ نو کوئی اُٹھے تو پھر فضا بدلے
یہ کارِ خاص، دماغِ کہن نہیں کرتے
سزا ہے حبِّ وطن کی جو ہو گئے آگاہ،
خدا گواہ کہ ذکرِ وطن نہیں کرتے
مقامیوں میں بھلا کیا مقام پہ اصرار
کبھی یہ جرمِ غریب الوطن نہیں کرتے
ہمارا حال بُرا، ہم بُرے، برا ماحول
مگر تجارتِ کردار و فن نہیں کرتے
نقوشِ آب ہیں دانش وہ شاعرانِ کرام!
قبول جو مرا رنگِ سخن نہیں کرتے

آزادی

عبادت ہے سراپا جذبۂ تعمیرِ آزادی
شہادت مستقل اک سُرخیِ تحریرِ آزادی
جہاں آزاد کر سکتے نہ ہوں تقریرِ آزادی

وُہ آزادی مری نظروں میں ہے تحقیرِ آزادی
فضائیں کر رہی ہیں ذوقِ ایثار و عمل پیدا
لہُو میں دوڑتا ہے شعلۂ تاثیرِ آزادی
لہُو موسم نے رویا، گردشِ گردوں نے رخ بدلا
مرے خوابوں میں نازل ہو گئی تعبیرِ آزادی
مجھے ہر نامناسب بات پر تنقید کا حق ہے
مری تقریر سے تعبیر ہے تعمیرِ آزادی
مجاہد کوہ و دریا کی حدوں میں رہ نہیں سکتے
ہماری جنگ ہو گی جنگِ عالمگیرِ آزادی

غلامی کے دھوئیں اُڑنے لگے بہروپیے کاپنے
فضاؤں میں جو گونجا نالۂ شب گیرِ آزادی
جو کہنا تھا اُسے سب کہہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیرِ آزادی
لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمّل ہے مگر تعمیرِ آزادی
ہر انداز تعیّن میں ہے پابندی فقیروں کو!
وہ زنجیرِ غلامی تھی یہ ہے زنجیرِ آزادی
تعجّب ہے غلامی کے شبستانوں کی زینت ہے
کھنچی ہے جو ہمارے خون سے تصویرِ آزادی
مجھے دُنیا کے ہر گوشے میں قندیلیں جلانے دو
مرا مذہب ہے اک پیغامِ عالمگیرِ آزادی!
تحیّر ہے کتاب اللہ زیبِ طاقِ نسیاں ہے
تعجّب ہے کوئی کرتا نہیں تفسیرِ آزادی
ابھی طوق و سلاسل میں ہیں آزادی کے دیوانے
مگر زِنداں کے دروازے پہ ہے تصویرِ آزادی

غلام ابنِ غلام اپنی وراثت کیوں سمجھتے ہیں
ہوئی ہے جب ہمارے نام پر تعمیرِ آزادی
رہے گا دینِ فطرت پھیل کر اقصائے عالم میں
نہیں ہے یہ خطِ سرحد، خطِ تقدیرِ آزادی
زمانے کو اب آزادی کے معنی ہم بتائیں گے
غلط ہوتی رہی ہے آج تک تفسیرِ آزادی

تڑپ کر بزم میں دانشؔ چلے آئے ہیں پروانے
اندھیروں سے مگر پھوٹی نہیں تنویرِ آزادی

خراشِ شوق

بتا کے ایسا رازِ خاص رازداں گزر گیا
دل و جگر سے ایک تیرِ بے اماں گزر گیا

نفس نفس پہ مغفرت، قدم قدم پہ برکتیں
جدھر جدھر کو وہ شفیعِ عاصیاں گزر گیا

جدھر نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گزر گیا

حیاتِ آدمی کا دور پرچموں کے سائے میں
سرور پاش و شاد کام و شادماں گزر گیا

شہادتوں کے شوق میں کفن سروں سے باندھ کر
بصد شکوہ و کامگار و کامراں گزر گیا

وہاں ہے آج تیرگی میں روشنی سی روشنی
جہاں ہمارا آفتابِ صوفشاں گزر گیا

نمودِ اجتماعیت وجودِ کائنات ہے

رواں دواں جو رہ گیا، رواں دواں گزر گیا

جہاد سے ہے عارضِ حیات پر شگفتگی

مگر یقیں سے اب یہ سُودِ بے زیاں گزر گیا

ابھی یہ شاید اہلِ گلستاں کو کچھ خبر نہیں

کہ گلستاں سے اُن کا دورِ گلفشاں گزر گیا!

یہ شاخِ گل پہ زمزموں کی دُھن تراشتے رہے

نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گزر گیا

دھواں یہ کس چتا کا ہے گھٹاؤں کے لباس میں

لگی ہوئی ہے آگ سی جہاں جہاں گزر گیا

روش روش، چمن چمن، یہاں لہو، وہاں لہو

بتاؤں کیا یہ حادثہ کہاں کہاں گزر گیا

سُنا ہے تتلیوں نے باغباں کی جیب کاٹ لی

حدودِ دشمناں سے جورِ دوستاں گزر گیا

وہ آنکھ کون سی ہے جو غمِ وفا سے تر نہیں!

ہر ایک پر یہ انقلابِ بے اماں گزر گیا!

سکونِ دل کی چیز ہے نہ عاشقی نہ دوستی
دلوں سے جذبۂ "حسابِ دوستاں" گزر گیا
یہ نیند ہے کہ موت ہے خمار ہے کہ جانکنی
حدودِ خفتگاں سے کسلِ خفتگاں گزر گیا
چلو کہ بج گیا گجر، اٹھو کہ صبح ہو گئی
بڑھو کہ وقتِ انتظارِ امتحاں گزر گیا
نظر اٹھاؤ اب وہ مہر و ماہ سب بدل گئے
خبر بھی ہے زمیں پہ کون آسماں گزر گیا
ابھی تو دھوپ چڑھ رہی ہے دوپہر کے واسطے
ابھی یہ دو قدم پہ ہے جو کارواں گزر گیا
نئے سرے سے پھر جگاؤ رہروانِ شوق کو!
اصولِ کارواں تو ہیں، جو کارواں گزر گیا
شجاعتوں سے کام لو جہاں سے انتقام لو
کہاں تمہارا جوشِ گرم و بے کراں گزر گیا
پیام دو کہ عصرِ نو کو چاہیے جواں لہو
پکار دو کہ وہ زمیں، وہ آسماں گزر گیا

آثارِ انقلاب

ہو جس جگہ دُعا کے چراغوں کی زرد ضو
تہذیب میں جہاں نہ رہے ارتقا کی رَو
سانچے جہاں چٹخنے لگیں اتحاد کے
شیشے جہاں درکنے لگیں اقتصاد کے
پستی پہ سر جھکا کے جہاں آسماں چلے
تنہا بھٹک بھٹک کے جہاں کارواں چلے
بے خوف ہو سکے نہ جہاں ذکرِ زندگی
رفعت پسند ہو نہ جہاں فکرِ زندگی
قائد جہاں عوام سے بازی گری کریں
لیڈر قدم قدم پہ جہاں تاجری کریں
مزدور کو ملے نہ جہاں جہد کا صلہ
ہو رہروؤں کے لب پہ جہاں خضر کا گلہ

ہر کارخانہ دارِ جہاں باشکوہ زر
سرطان بن چکا ہو تمدّن کی پشت پر
قیمت جہاں رہے نہ کچھ انساں کی جان کی
تخلیقِ رزق پہ نہ نظر ہو کسان کی
مذہب کھُلی فضا میں جہاں دم نہ لے سکے
زخمی جہاں پکار کے مرہم نہ لے سکے
رشتہ خواص کا نہ جہاں ہو عوام سے
باز آئے آدمی نہ جہاں انتقام سے
برپا ہوں اختلاف جہاں بات بات پر
روشن جہاں مرض ہوں حسینِ حیات پر
ملکی جہاں بنے ہوں حکومت کے مدّعی
ترسے جہاں حلال کی روزی کو زندگی،
تعلیم کا نظام جہاں ہو چکے خراب
نکلے جہاں گہن سے نہ صحّت کا آفتاب
ارکانِ احتساب غلط کار ہوں جہاں
بے خوف لوٹ مار کے بازار ہوں جہاں

غنڈے جہاں محُل ہوں عدالت کی راہ میں
شیطاں جہاں ہو سایۂ تاج و کلاہ میں
مُفلس جہاں ہو فکر، گدا ہو جہاں نظر
جُرم و گناہ پر نہ جہاں ہو سزا کا ڈر
عالِم جہاں ہوں دین فروشی سے شاد کام
دار و رسن سے لرزہ بر اندام ہوں عوام
سینوں میں در کھلیں نہ جہاں احتساب کے
سمجھو بہت قریب ہیں دن انقلاب کے

عالمِ گومگو

ہر چند سیاسی تحریکیں، سانچوں میں ستم کے ڈھلتی ہیں
اشکوں سے چراغاں ہوتا ہے بتی میں زبانیں جلتی ہیں
فطرت کے ارادے پڑھ لینا انسان کے بس کی بات نہیں
ادراک میں اتنی سوجھ نہیں، سائنس میں وہ آلات نہیں
شاہیں کے ہوائی حملوں کو بیچارہ معمولا کیا روکے
انسان لرزتے ہاتھوں سے تعمیر کا پہیّا کیا روکے
حکّام کے چٹیل ہاتھوں پر مہریں ہیں غلط پیمائی کی!
اخبار کا ہر تازہ مضمون اک بھاپ ہے گندے پانی کی
حلقومِ سکونِ انساں پر تخریب کا خنجر چلتا ہے
ایمان سے پرجا چڑھتی ہے، انصاف سے راجا جلتا ہے
کم بخت خزاں یوں لوٹتی ہے ذی رُوح تبسّم زاروں پر
ہر پھول کا دامن اُڑ اُڑ کر پھیلا ہے نکیلے خاروں پر

مسموم فضائی خبروں پر جیتے نہ، تو انساں کیا کرتے
بے ربط ہوا کی سانسوں سے اندازۂ طوفاں کیا کرتے
نازوں کے پلے انسانوں میں کشکول کی نوبت آ پہنچی
اجسام کے سودے ہوتے ہیں نیلام پہ عصمت آ پہنچی
افراط ہے بھرتی لاشوں کی انبوہ میں بے پرواؤں کے
گلیوں میں یتیموں کی چیخیں، پردے میں بیاں بیواؤں کے

۲

ارکانِ حکومت بھی ہیں، مگر میں بھی تو نگاہیں رکھتا ہوں
شدّت سے دھڑکتے سینے میں احساس کی آہیں رکھتا ہوں
دولت کا کلس جو پہلے تھا تابان و درخشاں آج بھی ہے
جلتا تھا جہاں دہقاں کا لہو اُس گھر میں چراغاں آج بھی ہے
سونے کے دہکتے دریا میں افلاس کا دھارا نا ممکن
سکّوں کے کھنکتے خرمن پر دمدار ستارا نا ممکن
بھوکوں پہ مسلسل ہنستی ہے مخلوق بلند ایوانوں کی
ٹکڑے کے عوض بک جاتی ہے گلیوں میں خودی انسانوں کی

احسانؔ لہو کا ہر قطرہ بے تاب ہے دل بن جانے کو
کل تک جو سخی کہلاتے تھے محتاج ہیں دانے دانے کو
ظلمت کے چھلاوے غرّائیں کھا کھا کے جگر قندیلوں کا
تقسیمِ نشیمن پر فائز انبوہِ ندیدی چیلوں کا
جھانکے نہ فلک جن صبحوں کو، تھوکے نہ قمر جن راتوں پر
ترجیح اُنہیں دی جاتی ہے اشکوں سے بھری برساتوں پر
تھی بانجھ زمیں جن کھیتوں کی دولت کی وہاں ارزانی ہے
ہر بھوک سے بڑھتا کھانا ہے، ہر پیاس سے اونچا پانی ہے
کس سمت سے دیکھیں لیتا ہے خورشیدِ درخشاں انگڑائی
باطل کی گھٹا نے چھینی ہے ذرّوں کی نظر سے بینائی

زندگی گزرتی ہے یوں کبھی کبھی تنہا
جس طرح مقابر میں شب کی خامشی تنہا

فطرتاً تو کرتا ہے سیکڑوں جتن، لیکن
ہر بشر اُٹھاتا ہے، بارِ زندگی تنہا،

علم بھی نہیں اُن کو اور اُن کے کوچے میں
جانے کب سے پھرتا ہے ایک اجنبی تنہا

ہر گمانِ منزل تک راستہ دکھاتی ہے
ظلمتِ دو عالم میں دل کی روشنی تنہا

انجمن کی شمعوں سے دل پگھلنے لگتے ہیں
کتنی جان لیوا ہے آپ کی کمی تنہا!

جس جگہ فرشتے بھی پرفشاں نہیں ہوتے
ایک دن رسا ہوگا ذوقِ آگہی تنہا!

اُن کی دلنوازی سے مہر و ماہ دلکش ہیں
آنسوؤں کا دریا ہے ورنہ چاندنی تنہا

ہے چمن حقیقت میں ایک شہرِ تنہائی
خار کی خلش تنہا، پھول کی ہنسی تنہا

جام دے کے جاتے ہو یہ تو کم سے کم سوچو
روح کا تشنّج ہے شغلِ مے کشی تنہا؟

دیکھئے تو برپا ہیں ہر قدم پہ ہنگامے
سوچئے تو دنیا میں ہے بس آدمی تنہا!

جو تری تمنّا میں دو جہاں سے درگزرے
آ کے اُن دِوانوں میں بیٹھ دو گھڑی تنہا

اک طویل مدّت سے ہے کشیدگی، لیکن
اب بھی آ نکلتے ہیں وہ کبھی کبھی تنہا

خلق اور خالق میں فاصلوں کی حد بھی ہو
روشنی کہاں تک دے شمعِ زندگی تنہا!

جادۂ محبت پر لاشریک چلتے ہیں!
راہرو سے رہبر تک ہیں یہاں سبھی تنہا

اب زمانہ سازوں کی قدر ہے یہاں دانشؔ
اور اپنا سرمایہ فنِ شاعری تنہا

یہ کشاکش کب تھی ممکن رہبرِ کامل کے بعد
راہزن اپنا بدل جاتا ہے ہر منزل کے بعد

پوچھئے ان سے جو بیٹھے بھی نہ تھے اور اٹھ گئے
آپ کا تو شغل ہی محفل ہوا محفل کے بعد

یوں جنوں نے دی تسلّی یوں ہوئی طے راہِ شوق
ہر قدم پر سامنے منزل رہی منزل کے بعد

آپ کا کیا! سُن کے برہم ہوں کہ رُہ جائیں خموش
ہم کہاں جائیں گے عرضِ مُدعائے دل کے بعد

آدمی کو خود نہیں اپنے سفر سے آگہی،
اس کی قسمت میں تو اک منزل ہے اک منزل کے بعد

تیرے ہوتے کس طرح بچتے حسینانِ جہاں
خاک ذرّوں پر نظر پڑتی مہِ کامل کے بعد؟

اپنا آغازِ سفر کرنے سے پہلے سوچ لو
زندگی اک جرم ہے محرومیِ منزل کے بعد

درمیانِ محمل و لیلےٰ ہیں لاکھوں فاصلے
جلوۂ لیلےٰ نہیں ہے پردۂ محمل کے بعد

کچھ تو ہوتا زمزمہ یا آہ، لیکن کچھ نہیں!
گوش بر آواز ہوں کب سے شکستِ دل کے بعد

آپ کے پیشِ نظر شمع و شراب و ساز و رقص
اور مجھے یہ فکر اس ہنگامۂ محفل کے بعد

دیکھ اب بھی مان لے کہنا سفینہ موڑ لے،
جانے پھر طوفاں میسّر ہو نہ ہو ساحل کے بعد

کیا فقط تھا حادثوں تک اتّحادِ کارواں
تم ہمیں اب کیوں نہیں پہچانتے منزل کے بعد

مردِ مومن کی نظر سے ہو کہ فیضِ عشق سے
آدمی بنتا ہے اصلاحِ مزاجِ دل کے بعد

فرصتِ ہستی میں تحقیقِ حق و باطل درست
لیکن اے احساںؔ تحقیقِ حق و باطل کے بعد؟

جو رشتۂ گل و شبنم سمجھ نہیں سکتے
مری نشاط مرا غم سمجھ نہیں سکتے

خوشی کو نذرِ محبت تو کر دیا لیکن
مآلِ دیدہ پُرنم سمجھ نہیں سکتے

مذاق ہے کہ نشیب و فرازِ دوراں کو
وہ جانتے ہیں مگر ہم سمجھ نہیں سکتے

وہ میرے ساتھ نہ آئیں جو دار و زنداں کو
نشاطِ شوق کا پرچم سمجھ نہیں سکتے

ہزار سایۂ عصیاں خنک سہی لیکن
ہم اس کو دامنِ مریم سمجھ نہیں سکتے

اس اختلاف کو ثالث مٹائینگے آکر
جس اختلاف کو تم ہم سمجھ نہیں سکتے

نہیں ہے عشق اگر خود غرض تو حسن کو بھی
بہ اعتبارِ وفا کم سمجھ نہیں سکتے

قدم قدم پہ ہے ٹھوکر نفس نفس پہ ملال
جو زندگی کو ترا غم سمجھ نہیں سکتے

ستم تو یہ ہے مرے اشک پونچھنے والے
وجوہِ گریۂ پیہم سمجھ نہیں سکتے

مذاقِ نقدِ تبسم جنہیں نصیب نہیں
وہ لوگ عظمتِ ماتم سمجھ نہیں سکتے

وہ کیا کرینگے محبت وہ کیا اٹھائینگے ناز
جو دجرِ تلخیٔ باہم سمجھ نہیں سکتے

خدا گواہ کہ ہم صرف ماہ و انجم تک
رسائی دلِ آدم سمجھ نہیں سکتے

ہمیں خبر ہے ہمیں تجربہ ہے برسوں کا
کسی کو ہم ترا محرم سمجھ نہیں سکتے

یہ آدمی کہ بلوغِ خرد سے عاری ہیں
مزاجِ بزمِ دو عالم سمجھ نہیں سکتے

ہیں خود غرض جو محبت کے باوجود اے دوست
تری رضا کو مقدم سمجھ نہیں سکتے

خموش کیوں ہو بتاؤ تو وجہِ خاموشی
وہ بات کیا ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے

فریبِ حُسن ہو یا جبرِ عشق ہم دانشؔ
جو آگ ہے اُسے شبنم سمجھ نہیں سکتے

عشق کی طبیعت جب درد آشنا ہو گی !
ہر نفس کی ناسازی حُسن تک رسا ہو گی

اب کسی تمنّا کا دل اثر نہیں لیتا
جانے کِس جگہ جا کر غم کی انتہا ہو گی

اشک ہو کہ شیون ہو شرط ہے جنوں مندی
جو اساس اٹھے گی کیوں نہ دیر پا ہو گی!

عشق تا بکے رُسوا، کم سواد لوگوں میں !
آشکارِ دنیا پر عظمتِ وفا ہو گی

ذوقِ جستجو ہوتے راہِ خضر کیوں دیکھیں
شدتِ جنوں خود ہی بڑھ کے رہنما ہو گی

حق پرست کیا جانیں دار کیا ہے زنداں کیا
ان کی بات جو ہو گی، تلخ و برملا ہو گی !

خوف کیا محبت میں بے جھجک ملو ہم سے
یہ ذلیل دنیا ہے، ہو اگر خفا ہو گی!!

موسموں پہ جب ہو گی حکمرانیٔ انساں
پھول جانے کیا ہوں گے، جانے کیا صبا ہو گی

تم نے خود نگاہوں کو ذوقِ دید بخشا ہے

اب اصُولِ جلوہ کی احتیاط کیا ہوگی

اہلِ دل بتاتے ہیں مرکزِ جنوں جس کو!

ایک دن وہاں تک بھی عقل ہی رسا ہوگی،

ضبط کے احاطے میں رہ کے جو قیامت ہے

بات جب وہ ہونٹوں تک آ گئی تو کیا ہوگی

مجھ کو فکر اس کی ہے ظلمتیں نہ بڑھ جائیں

اِن نئے چراغوں سے روشنی تو کیا ہوگی

مشورے سے کانٹوں کے ہر کلی نکلتی ہے

ہر نئی مسرت کی غم سے ابتدا ہوگی

اس سوادِ منزل کی سمت ہے رواں انساں

دیکھنا قیامت بھی راہ میں بپا ہوگی

ہر طرف وہ پھیلے گی روشنی بصیرت کی

آدمی جو سوچے گا، مرضئ خُدا ہوگی!

یہ بجا کہ اب دُنیا ہے مخالف اے دانش

کل وہ لوگ آئیں گے خود یہ ہمنوا ہوگی!

بُت پرستی کا جو حق ہے وہ ادا بھی تو کرو
سجدہ جس بُت کو کرو اُس کو خُدا بھی تو کرو

برق و صرصر کے اصولوں پہ جیو گے کب تک
دوستو پیروِی بادِ صبا بھی تو کرو!

مَیں اشارات و کنایات سے بے بہرہ ہُوں
جو ہو مقصد اسے لفظوں میں ادا بھی تو کرو

اپنے انکار میں تکمیل کی خاطر ہی سہی
عقل کہتی ہے کہ اقرارِ خدا بھی تو کرو!

شکوۂ جور و ستم کا تمہیں حق ہے، لیکن
حُسن والوں سے جہاں تک ہو وفا بھی تو کرو

رنگِ تہذیب و تمدُّن کو بدلنے کے لیے
اپنے بیمار خیالوں کی دوا بھی تو کرو

ذاتِ باری سے تقاضا تو کوئی جُرم نہیں
روح کی جس میں تڑپ ہو وہ دعا بھی تو کرو

صرف کلیوں کا لہو پی کے پنپنا کیسا
فرض جو اہلِ چمن کا ہے ادا بھی تو کرو!

ذوقِ انساں پہ ہے فردوس و جہنّم کا مدار
جس کی رحمت کو طلب ہے وہ خطا بھی تو کرو

عرش تک سیکڑوں رستے ہیں بلندی کے لیے
عرش تک اپنے تصوّر کو رسا بھی تو کرو!

اُمّتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں"!
آدمی ہو ارے کچھ شرم و حیا بھی تو کرو

میرا ذمّہ ہے جو دانشؔ نہ ملے دل کی مراد
ان کے کوچے میں خموشی کو صدا بھی تو کرو

رازِ الفت چھپا کے پچھتائے ظرفِ دل آزما کے پچھتائے
ہے نشاطِ نظر تو بے بنیاد غم سے دامن بچا کے پچھتائے
اُن سے مایوس ہو کے زندہ ہے دل کو جینا سکھا کے پچھتائے
اِس چمن پر خدا کی رحمت ہو ہم نشیمن بنا کے پچھتائے
وہ اچانک ملے تو ہم ہی نہیں وہ بھی نظریں جھکا کے پچھتائے
شکریہ زندگی کی نعمت کا! ہنس کے روئے، ہنسا کے پچھتائے
آہ اب اعتمادِ عشق گیا حسن کو آزما کے پچھتائے
اِک بالاقساط خودکشی ہے وفا! ہم بھی یہ زہر کھا کے پچھتائے
آئی ہوگی کسی کو راس خوشی بیشتر مُسکرا کے پچھتائے
رہزنوں نے بُنے ہوئے تھے سراب کارواں خاک اُڑا کے پچھتائے
عشق سے ڈر کہ یہ وہ دولت ہے کھو کے پچھتائے پا کے پچھتائے

کوئی اپنا نظر نہیں آتا | اُن کو اپنا بنا کے پچھتائے
آنکھ کس کس سمت اٹھتی ہے | اُن کے دھوکے میں آ کے پچھتائے
عشق کمبخت کو خدا سمجھے | اس پہ ایمان لا کے پچھتائے
لے اُڑے حسن کو ہوس کے غلام | جو تھے حامی وفا کے پچھتائے
بعض شعلے بجھا کے رنج ہوا | بعض شمعیں جلا کے پچھتائے
رہزنوں سے جنہیں شکایت تھی | رہنماؤں میں آ کے پچھتائے

اُن ستاروں میں ہم بھی ہیں دانش
جو زمینوں پہ آ کے پچھتائے

وہ خزاں بھی ہے خوشگوار اے دوست
جس کی قسمت نہیں بہار اے دوست!
تا بکے جلوۂ بہار اے دوست
رنگ و بُو سب ہیں مستعار اے دوست
عشق اوچھا ہے، حُسن ہرجائی!!
اب محبّت ہے کاروبار اے دوست!
عشق ہے دَورِ خود شناسی میں!
اپنے جلووں سے ہوشیار اے دوست
رفتہ رفتہ وہ پھُول ٹوٹ گئے!
جن پہ تھا باغ کا مدار اے دوست
دیکھتے اب کہاں رُکیں جا کر
انقلاباتِ رُوزگار اے دوست

وہ گدا بھی ہیں اب خراب و زبُوں
ہیں جو در اصل شہریار اے دوست
باغبانوں کے ساز باز نہ پُوچھ
لُٹ رہی ہے بھری بہار اے دوست
دیدۂ و دل تو دیدۂ و دل ہیں
دیدۂ و دل کا اعتبار اے دوست؟
غم مکمّل ہوا ، سُکون ہُوا !
پھر کوئی زخم یادگار اے دوست
یا تو اب باغباں پھلے پھُولے
یا رہی باغ میں بہار اے دوست
میری آخر خطا ، قُصُور مرا ؟
کیوں ازل سے ہُوں بیقرار اے دوست
سُوکھ کر پھُول بن گئے کانٹے !
آہ یہ عالمِ بہار اے دوست
اب ہے پھر ابتری زمانے میں
اب ہے پھر تیرا انتظار اے دوست

مدّتوں اک ذرا سی تلخی پر!
دِل سے چھٹتا نہیں غبار اے دوست
یہ لہو، یہ کملے ڈلے غنچے!
یہ نہیں ہے مری بہار اے دوست
جانے کتنے ہیں خستہ جاں دانشؔ
ہم فقیروں میں شہر یار اے دوست

بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا
کیوں نہ آئے عشق کے لب پر گلہ بھی آئے گا

دارو زنداں کے پرستارو یونہی ہنستے رہو
آئے گا، دَورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا

تہ نشیں ہو موجہ و طوفاں کا دامن چھوڑ کر
خود بخود کشتی ڈبو کرنا خُدا بھی آئے گا

روحِ گلشن خاک کے ذرّوں میں بیگی کروٹیں
اک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا!

پہلے اپنے دست و بازو پر تو کرلے اعتماد
پھر مرا ذِمّہ تعاوُن کو خدا بھی آئے گا

آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے بھلا
کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا!

گھر میں بیٹھے گمرہی کا شکوۂ بے جا نہ کر!
رہروؤں کو جمع کر لے، رہنما بھی آئے گا

ہو گئے جُرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر
اُن کے لب پر نعرۂ جولاں کُشا بھی آئے گا

عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی
حسن پر اک وقتِ احساسِ جفا بھی آئے گا!

ہر قدم اب قافلے کو ہے یقینِ گمرہی
جانے کوئی میرِ منزل آشنا بھی آئے گا

یونہی دریا میں اگر خونی بھنور پڑتے رہے
ناخدا کیا، زیرِ غور اک دن خُدا بھی آئے گا

تشنگی در تشنگی ہے اور سراب اندر سراب
جانے اِن راہوں میں کوئی نقشِ پا بھی آئے گا

جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہو گی مستجاب
جب کوئی بندہ پکارے گا خدا بھی آئے گا

کب تک اِن اُجلے اندھیروں کی قیادت میں سفر
کوئی تارا چرخ پر منزل نُما بھی آئے گا

اِس دیارِ خود غرض میں، اِس ہجُومِ کور میں
عنقریب اک مُحسنِ خلقِ خدا بھی آئے گا
زندگانی کے حقائق کی طرف دعوت تو دے
آشنا بھی آئے گا نا آشنا بھی آئے گا
زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تا بکے
ایک دَورِ احسآن حسبِ مُدّعا بھی آئے گا

خموشی سے مذاقِ عشق پنہاں ہو نہیں سکتا
یہ شعلہ ہے چراغِ زیرِ داماں ہو نہیں سکتا

وہ بجلی کی نہیں تقدیرِ موسےٰ کی تجلّی تھی
سرِ طُور اب بایں صورت چراغاں ہو نہیں سکتا

زوالِ لالہ و گُل سے نمودِ لالہ و گُل ہے !
مگر انسان مِٹتا ہے تو انساں ہو نہیں سکتا

در و دیوار دیوانوں کا رستہ چھوڑ دیتے ہیں
ہمیشہ کو جُنوں مجبورِ زنداں ہو نہیں سکتا

حدودِ بندگی میں دل کو جو آسُودگی دیدے
وہ سجدہ باعثِ تکمیلِ انساں ہو نہیں سکتا

مری ناقص نظر میں یہ بھی اک توہینِ وحدت ہے
جہاں تو ہے وہاں جلووں کا اِمکاں ہو نہیں سکتا

مقامِ عرش و سدرہ اس کی دہلیزوں میں آتے ہیں
فرشتہ ہمپرِ پروازِ انساں ہو نہیں سکتا !

مَیں دیوانہ بھلا، مجھ کو مرے صحرا میں پہنچا دو
کہ مَیں پابندِ آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

فرازِ طور و محرابِ حرم کہنے کی باتیں ہیں
اگر چاہے کہاں وہ جلوہ افشاں ہو نہیں سکتا

اسی کا سلسلہ ہے میرا چاکِ جامۂ ہستی
گریباں تک فقط چاکِ گریباں ہو نہیں سکتا

مری مانو کہ ہستی نیستی بننے سے قاصر ہے
مَیں کہتا ہوں کہ یہ انجامِ انساں ہو نہیں سکتا

بہت فرعون ابھی جھوٹی خدائی کرنے آئینگے
ابھی باطل کا شیرازہ پریشاں ہو نہیں سکتا

خودی کے بعد گنجائش خدا کی ہو نہ ہو لیکن
خودی جس میں نہ ہو قلبِ مسلماں ہو نہیں سکتا

اسے اب بھی سزائے حضرتِ آدم ہی ملتی ہے
فرشتے کو جو یہ سمجھے کہ شیطاں ہو نہیں سکتا

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں جس امامِ آدمیّت کو
اِن انسانوں کے جنگل میں وہ انساں ہو نہیں سکتا
یہ گستاخی تو ہے لیکن میں اس جلوے کا طالب ہوں
بقیدِ رنگ و صورت جو نمایاں ہو نہیں سکتا
غمِ دنیا کے مارے آ بسیں میری پناہوں میں
جہاں مَیں ہوں وہاں دنیا کا امکاں ہو نہیں سکتا
بعثتِ احسان انکی دوستی پر ناز ہے تجھ کو
ہمیشہ کیلئے انساں کا انساں ہو نہیں سکتا

نہ خود کو حد سے بڑھاؤ ہماری بات سُنو
بس اب پیو نہ پلاؤ ہماری بات سُنو

بڑی امید ہے یہ رات پھر بھی آئے گی
چراغِ اشک بجھاؤ ہماری بات سُنو

بدل رہا ہے زمانہ نئے نئے انداز!
اس اِنقلاب میں آؤ ہماری بات سُنو

یہ زندگی کا تشنّج، یہ جُرأتوں کی تھکن
لپک کے جام اٹھاؤ ہماری بات سُنو

وفورِ غم سے مُداوائے غم نہیں ہوتا۔
بہت نہ اشک بہاؤ ہماری بات سُنو

کسی امید پہ زندہ ہیں تارکانِ وطن!
انہیں بہت نہ ستاؤ ہماری بات سُنو

خرد کی رات فقط سازشوں میں گزری ہے
جنوں کی خیر مناؤ ہماری بات سُنو
خفا خفا ہیں اجالے، اداس اداس سحر!
دلوں کی جوت جگاؤ ہماری بات سُنو
دھندک رہے ہیں دھندلکے، سُلگ رہی ہے شفق
فریبِ وقت نہ کھاؤ ہماری بات سُنو
پٹے پڑے ہیں اندھیروں سے روشنی کے نشیب
چراغِ روح جلاؤ ہماری بات سُنو
بکھر رہا ہے ستاروں کے کارواں کا غبار
سحر کو بھول نہ جاؤ ہماری بات سُنو
لہو لہان ہے مشرق، دھواں دھواں ہے اُفق
کہاں ہو ہوش میں آؤ ہماری بات سُنو
سیاہ و سُرخ بگولوں کا ہو چکا آغاز
چمن کدوں کو بچاؤ ہماری بات سُنو
سُدھر رہے ہیں بیاباں، سُلگ رہے ہیں چمن
نہ اور ڈیک لگاؤ ہماری بات سُنو!

ابھی تو دھند میں چہرے پڑھے نہیں جاتے !
ابھی تو وقت ہے آؤ ہماری بات سُنو
نہ ڈھل سکیں گے مشینوں میں آفتاب و نجوم
جہانِ نو کے خداؤ ہماری بات سُنو
تمام رات بتوں میں گزار دی ہوا نشؔ
دُعا کو ہاتھ اٹھاؤ ہماری بات سُنو

ہمارا ہو گیا وہ دشمنِ جاں کوَن کہتا ہَے !
کبھی یکجا ہوئے ہیں کفر و ایماں کون کہتا ہے

قناعت کر کے امّیدوں کو بہلانے سے کیا حاصل
کبھی مشکل ہوئی ہے یوں بھی آساں کون کہتا ہے

میسّر ہے مجھے صبحِ وطن یہ تو بجا، لیکن!
نہیں یہ سر بسر شامِ غریباں کون کہتا ہے

درِ زنداں پہ جو اپنے مقاصد کے محافظ ہیں
سنا دیں گے ہمیں رودادِ زنداں کون کہتا ہے

کہیں جُھلسی ہوئی شاخیں کہیں بکھری ہوئی کلیاں
تباہی ہے اسے حسنِ بہاراں کون کہتا ہے

قفس ہو تنگ یا صیّاد کے جورِ مسلسل ہوں
رہیں گے چُپ نوا سنجِ گلستاں کون کہتا ہے

ہوا کرتے ہیں آثار و قرائن ہی سے اندازے
خزاں کی شام کو صبحِ بہاراں کون کہتا ہے

ہے جن کا ہاتھ تخریبِ تمدّن کی مساعی میں
بنائیں گے یہ مستقبل کے ایواں کون کہتا ہے

چمن کی پشت سے آتی ہیں آوازیں کُدالوں کی
نہیں خطرہ میں دیوارِ گلستاں کون کہتا ہے

چُھپائیں لاکھ تہذیب و تمدّن کے سیہ پردے
چھپے گی سُرخیِ خونِ شہیداں کون کہتا ہے

نہ سختی پاسبانوں کی، نہ مقصد اہلِ زنداں کا
لکھی جاتی ہے یوں تاریخِ زنداں کون کہتا ہے

ہیں روحیں جن کی مجرم جسم شاداب معاصی ہیں
انہیں غربت سے پامال و پریشاں کون کہتا ہے

ابھی ہے جوں کی توں خونیں شفق مشرق کے ماتھے پر
ابھی خطرہ سے باہر ہے گلستاں کون کہتا ہے!

ارادے پست، منصوبے غلط، ذوقِ طلب ناقص
بہ ایں عالم اِنہیں مردِ مسلماں کون کہتا ہے!

یہ مانا میرے غمخانے میں تاریکی نہیں لیکن
یہ آنسو ہیں، انہیں شمعِ فروزاں کون کہتا ہے
چمن میں گرم تاریکی کا سایہ دیکھنے والے
دُھواں ہے یہ اسے ابرِ بہاراں کون کہتا ہے
ہوائیں بند، مٹّی تشنہ لب اور چاندنی راتیں
نہیں آئے گا اب اِک اَور طُوفاں کون کہتا ہے

سُنا تو اَور کچھ تھا یہ فضا کچھ اَور کہتی ہے
یہاں تو ذرّے ذرّے کی اَدا کچھ اَور کہتی ہے

زبان و دِل میں ڈھونڈے سے ہم آہنگی نہیں ملتی
اثر کچھ اَور کہتا ہے دُعا کچھ اَور کہتی ہے،

لگے ہیں قفل اب طوق و سلاسل کی زبانوں پر
درو دیوارِ زنداں کی فضا کچھ اَور کہتی ہے

خرد پیشہ پشیماں ہیں مآلِ زود فہمی پر!
جنوں مندوں میں نالوں کی فضا کچھ اور کہتی ہے

ابھی موقع ہے کر لیں صبح کا ماتم لگے ہاتھوں،
کہ ان بجھتے ستاروں کی ضیا کچھ اَور کہتی ہے

مَیں اپنے خون کا پیاسا، میں اپنا عافیت دشمن
مجھے اب وہ نگاہِ نازکیں کچھ اور کہتی ہے

یہ کس کے آستاں پر ڈالدی لاکر جبیں میں نے
یہاں تو عظمتِ ارض و سما کچھ اور کہتی ہے

بہت ہی زعم ہے جھوٹے خداؤں کو خدائی پر
انہیں یہ کیا خبر خلقِ خدا کچھ اَور کہتی ہے

نہ گل ہنسنے پہ قادر ہیں، نہ غنچے مسکرانے پر
چمن میں آج کل بادِ صبا کچھ اَور کہتی ہے

حفاظت اپنے کھلیانوں کی پہلا فرض ہے تیرا
ترے کھیتوں پہ ساون کی گھٹا کچھ اور کہتی ہے

خرد لاکھوں دلیلیں لا رہی ہے بے ثباتی پر
مگر تعمیرِ ہستی کی بِنا کچھ اَور کہتی ہے

ادھر چیں بر جبیں سائنس پر مذہب کے ہنگامے
ادھر رفتارِ نبضِ ارتقا کچھ اور کہتی ہے

یہ ڈھلتی رات، یہ سونی منڈیریں، مضمحل تارے
مجھے اس وقت کی گونگی فضا کچھ اور کہتی ہے

تعصّب نے یہاں کھینچی ہیں انسانوں میں دیواریں
ابھی اس ملک کی آب و ہوا کچھ اور کہتی ہے

نہ ان پر اختیار اپنا، نہ قدرت ترکِ الفت پر
خودی کچھ اَور کہتی ہے وفا کچھ اور کہتی ہے

حرم کی پاسبانی صرف سجدوں سے نہیں ہوگی
کہ اب خاکِ زمینِ کربلا کچھ اَور کہتی ہے

یہ ناقص انقلاب احسان فنکاروں کو کیا دیگا
یہ شورش ابتدا تا انتہا کچھ اور کہتی ہے

فطرت کا جو وعدہ ہے وفا ہو کے رہے گا
ہر ذرّہ سرِ عرش رسا ہو کے رہے گا
مستقبلِ انساں ہے قیاسات سے باہر!
خاکم بدہن یہ تو خُدا ہو کے رہے گا
ڈھائیں گے عقائد کے گھروندوں کو نئے لوگ
اس بزم کا نقشہ ہی نیا ہو کے رہے گا
اب تک جو چلا آتا ہے پردے میں بہر رنگ
ہر رنگ سے اب جلوہ نُما ہو کے رہے گا
اب پھر ہیں فضاؤں میں تغیّر کے علامات
اب پھر کوئی ہنگامہ بپا ہو کے رہے گا
سمجھو نہ حقیر اس غمِ منزل کے جنوں کو
یہ درد تو دنیا کی دَوا ہو کے رہے گا!!

وہ ہو کے رہا جس کی توقع ہی نہیں تھی!
کِس طرح کہے کوئی کہ کیا ہو کے رہیگا

ظلمات سے پھُوٹیں گے مہ و انجم و خورشید
ہر ذرّہ تعیّن سے رہا ہو کے رہے گا

اِس دَور کی تحلیلِ عناصر پہ نظر ہے
اِس فرض سے یہ عہدہ برآ ہو کے رہے گا

وہ سجدہ جو محفوظ رہا دیر و حرم سے
شاید ترے قدموں پہ ادا ہو کے رہے گا

کب تک سرِ منبر یہ دنائت کی تجاویز
ہر قلب کو الہامِ وفا ہو کے رہے گا

تحصیلِ مقاصد میں عقیدوں سے نہ کھیلو
یہ خام نشانہ ہے خطا ہو کے رہے گا

تم ہو گے جہاں، حُسن کے افسانے چھڑیں گے
ہم ہوں گے جہاں ذکرِ وفا ہو کے رہے گا

اشکوں کو نشاطِ ابدی مِل کے رہے گی
ہر سازِ طرب دَرد نوا ہو کے رہے گا!

اظہارِ حقیقت پہ سہے جاؤ سزائیں !
یہ زہر کسی روز دوا ہو کے رہے گا !

بیدردِ جفا پر کفِ افسوس ملیں گے
مظلوم ثنا خوانِ وفا ہو کے رہے گا

غفلت کا تمہاری یہی عالم ہے تو اک دن
جو دیکھ چکے اس سے سوا ہو کے رہے گا !

اے غائتِ ہستی پہ نظر ڈالنے والو
یہ عُقدہ اچانک کبھی وا ہو کے رہے گا

اب حُسن میں تقدیسِ تجلّی نہیں باقی
اب عشق سُبکدوشِ وفا ہو کے رہے گا !

کب تک یہ قناعت سے شب و روز کی توہین
یہ بھی کبھی سوچا ہے کہ کیا ہو کے رہے گا !

وہ خالقِ تہذیب ہے وہ رُوحِ تقدّس،
اس نے جو کہا ہے بخُدا ہو کے رہے گا

احسان ہمیں بھی تو ہے الہام سے نسبت
ہم نے جو کہا، سن بھی لیا ؛ ہو کے رہے گا

ہر لحظہ نگاہوں میں ہے رنگِ دو جہاں اَور
ہم اہلِ جنوں میں ہیں زماں اَور مکاں اَور
ٹھہرے گا کہاں قافلۂ عمرِ رواں اَور؟
اس در کے سوا ہے بھی کہیں امن و اماں اَور
ان سے تو سروکار نہیں دیکھنا یہ ہے،
جاتی ہے یہ ظالم نگہِ شوق کہاں اَور
آئینے میں تصویر ٹھہرتی نہیں کوئی!
اک یہ بھی بڑھا حیرتیٔ روئے تباں اَور
یہ شکر کی جا ہے کہ انہیں یاد ہے تو بھی
یہ درد کی دولت بھی میسّر ہے کہاں اَور
آزادیِ جمہور کے مارے ہوئے انساں
اس در کے سوا آ کے اترتے بھی کہاں اَور

اس شہر کی بولی سے نہیں کان شناسا
رائج ہے مضافاتِ محبت میں زباں اور
آتی نہیں دل تک وہ نگاہوں کی شعاعیں
ڈھونڈیں گے کوئی کوچۂ آئینہ وشاں اور
اس طوق کی سختی سے گلا جتنا گھُٹے گا
پھیلے گا چمن میں مرا اندازِ بیاں اور
صیاد ہے آگاہ نہ گلچیں کو یہ معلوم
شاخوں پہ نہ ہوں پھول تو رہتے ہیں کہاں اور

داتا کے نگر میں جو زمیں گیر ہے دانش
ملتے ہیں اب اس شان کے درویش کہاں اور

ترقی اردو
نئی دہلی

دامن سے مِلا ہے نہ گریباں سے ملا ہے
پیغامِ جنوں سَیلِ بہاراں سے مِلا ہے

کیوں جانے پسند آئی مجھے اپنی تباہی
کیوں جانے دل اس فتنۂ دوراں سے ملا ہے

کچھ بھی نہ سہی پھر بھی غنیمت ہے سُرِشت
اک طرزِ فغاں شورشِ زنداں سے مِلا ہے

پھیلی ہوئی دل میں ہیں تری یاد کی راہیں
یہ شہر اسی وسعتِ ویراں سے مِلا ہے

ہر درد عطیّہ ہے کسی لالہ قبا کا
ہر زخم کسی جانِ بہاراں سے مِلا ہے

ہر چند کئی بار ہُوا خود بھی پشیماں
دل پھر بھی اسی زود پشیماں سے ملا ہے

مجھ سے نظر آئے شبِ وصل کے ارماں
جب عشق اکیلا غمِ دوراں سے مِلا ہے

گلشن میں کبھی دشت سے آیا نہ پلٹ کر
اک بار جو اربابِ گلستاں سے ملا ہے

جھنکار ہے اشکوں کی نہ احساس کی آہٹ
اب کوئے طلب شہرِ خموشاں سے ملا ہے

مشرب میں مرے فرض ہے انسان کی تعظیم
خالق کا تصور مجھے انساں سے ملا ہے

اشکوں کو نتھارا تو مِلے تہ میں تبسم،
جینے کا مزا موت کے ارماں سے مِلا ہے

اس کوچے میں ہر خاک سے لپٹا ہوا سایہ
انساں کی طرح سینۂ انساں سے مِلا ہے

جو رنگ ہے سورج کی شعاعوں سے ہے مشتق
ہر گل کو سبق چاک گریباں سے ملا ہے

اپنا بھی پتہ کوششِ بسیار سے دانش
خود اپنے ہی دشتِ دلِ ویراں سے ملا ہے